ماہنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

MAY 1986

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

مئی ۱۹۸۶ء

مدیر منتظم:- نور محمد فلاحی

مدیر:- طارق فارقلیط فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

قیمت فی شمارہ ۲ روپیہ ۵۰ پیسے
سالانہ تعاون ۲۵ روپے

ترسیل زر کا پتہ

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ (یو.پی) ۲۷۶۰۰۱

نقوشِ حیاتِ نو

		صفحہ نمبر
اداریہ		
رمضان تیرا آنا مبارک ہو	ایڈیٹر	۳
مقالات		
روزہ کا اصل مقصد	امام عصر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۱۸
ملک کی موجودہ صورت حال اور امت مسلمہ کی ذمہ داریاں	مقبول احمد فلاحی	۷
اسلامی ادب میں عقیدہ کا تصور	محمد عارف اعظمی	۳۰
کیا حضرت ابوبکر سخت گیر نہ تھے	محمد مسعود عالم قاسمی	۲۴
الحاد سے اسلام تک	سید عظیم شاہ بخاری	۳۶
تاریخ کی شہادت		
حضرت عتبہ بن غزوان	ابو جاوید	۴۳
حضرت خنساء رضی اللہ عنہا	ماسٹر اقبال ایم اے	۵۰
شعر و نغمہ		
غزل	عزیز بگھروی	۳۸
غزل	نورالدین قادری نور	۲۹
غزل	ادریس ضیاء	۳۵
غزل	شفق طاہری	۵۲
کشاکش	نورالدین قادری نور	۲۹
حلقہ یاراں	عزیز بگھروی، عزیزالدین عزیز	۵۳
جامعہ کے لیل و نہار	ال م	۵۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

رمضان! تیرا آنا مبارک ہو

رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ، تعلق باللہ کا موسم رمضان! تیرے آنے سے ہمیں بے انتہا مسرت ہوئی کیونکہ تو ہمارے لئے سراپا خیر و برکت ہے۔ تیری راتیں نورانی اور تیرے ایام سعید ہیں، تیرے جلو میں خدا کی عنایتیں، مہربانیاں، بخششیں اور عفو و درگذر کا ورود ہوتا ہے۔ سرکش شیاطین انس و جن قید کر دیے جاتے ہیں، جہنم کے تمام دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور جنت کے تمام دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور کوئی دروازہ بند نہیں رہتا اور فرشتے آواز دیتے ہیں بھلائی کے چاہنے والو! آگے بڑھو شر پسندو! رک جاؤ، اور اللہ تعالیٰ ہر رات آگ سے لوگوں کو نجات دیتے ہیں۔

تمام سال رمضان کے لئے جنت سجائی جاتی ہے اور جب رمضان آجاتا ہے تو عرش جنت کے درختوں سے اٹھکھیلیاں کرنے لگتی ہیں اور ہر طرف پتوں کی شہنائیاں سی بجنے لگتی ہیں، جنت کی حوریں اس منظر سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگتی ہیں، خدایا ہمیں ایسا جوڑا عنایت کر جو رمضان کی برکتوں سے فیضیاب ہو اور جس سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، اور جن کے لئے ہم باعث سکون و راحت ہوں۔ حضور نے ارشاد فرمایا جو بھی بندہ رمضان کے کسی دن کا روزہ رکھتا ہے تو اس کے لئے بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت عورت کا جوڑا مقرر کر دیا جائے گا۔"

رمضان! تجھے ہم دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتے ہیں کیونکہ تو برائیوں سے مقابلہ کے لئے ایک ڈھال ہے۔ جسم و روح کی صحت کا ضامن ہے۔ خدا سے قربت کا ذریعہ ہے، نیکیوں کو دوچند کرنے والا اور برائیوں سے دور کرنے والا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کا ہر عمل خدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے۔ ایک نیکی دس گنی سے سات سو گنی تک پھلتی پھولتی ہے مگر اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے کہ روزہ اس سے مستثنیٰ ہے وہ خاص میرے لئے ہے اور میں اس کا جتنا چاہتا ہوں بدلہ دیتا ہوں۔" "جس نے ایمان اور احتساب کے ساتھ روزہ رکھا اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔" اس میں ایک رات ایسی ہے جس کی عبادت ہزار مہینوں کے برابر ہے۔

رمضان! تجھ سے ہمیں شدید محبت ہے، کیونکہ ہمارے رہبر و رہنما حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیری راتوں میں جاگا کرتے تھے اور خدا کو یاد کیا کرتے تھے جبرئیل امین کے ساتھ دو دو بار قرآن ختم کرتے اور ہواؤں سے زیادہ سخی و فیاض بن جاتے اور جب آخری عشرہ آتا تو اپنے اہل و عیال کو بھی جگاتے اور لیلۃ القدر کو تلاش کرتے۔ درود ہو ہمارے نبی پر! سلام ہو ہمارے نبی پر۔

رمضان! تجھے ہم قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اللہ رب العزت کا شکر بجا لاتے ہیں کہ تیری راتوں میں ایک ایسی کتاب نازل ہونا شروع ہوئی جس کا نام قرآن رکھا گیا۔ ہدایت و رہنمائی کی کتاب، نجات و خیر و برکت کی کتاب۔ دنیا میں واحد کتاب ہے جو خدا کی بھیجی ہوئی ہے اور اپنی اصلی صورت میں باقی ہے اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی اور قیامت تک نہیں ہوگی کیونکہ خدا خود اس کا محافظ و نگہبان ہے۔ دنیا جب تک اس پر چلے گی کامیاب و کامران رہے گی اور جب اس کو چھوڑ دے گی ناکام و نامراد ہو جائے گی۔

رمضان! ہم عہد کرتے ہیں کہ تجھے ضائع نہ کریں گے۔ تیری راتوں کو جاگیں گے نمازیں اور تراویح پڑھیں گے تلاوت کریں گے، روزے رکھیں گے، خدا سے تعلق کو استوار کریں گے اور اپنی بگڑی ہوئی قسمتوں کو بنائیں گے۔ خدا ہم سے روٹھ گیا ہے ہم اسے منائیں گے ہماری زندگی شیطان کے راستے پر چل رہی ہے ہم اس سے توبہ کریں گے اور خدا کی ہدایت کے مطابق گذارنے کا عزم کریں گے۔

مگر رمضان! ذرا سوچو تو تم کیسے وقت میں آئے ہو، کل اور آج میں کتنا فرق ہے۔ ہمارا بدن زخموں سے چور چور ہے، قلب و جگر زخمی ہے اور رواں رواں چیخ رہا ہے۔ ہمارے چاروں طرف سازشوں کا جال تنا ہوا ہے اور ہم ہر طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں ہیں۔

روسی بھیڑیئے آج سات سال سے افغانستان میں چیر پھاڑ کر رہے ہیں اور بچے اور کمزور

مسلمان شہریوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ ہزاروں ایکڑ فصلوں کو تباہ و تاراج کر دیا۔ گھروں کو مسمار کر دیا۔ شہری آبادیوں پر بمباری کی اور جینا دوبھر کر دیا۔ لاکھوں انسانوں کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا اور مسلسل بمباری اور قتل جاری رکھے ہوئے ہیں۔

امریکہ کی غنڈہ گردی اور دہشت پسندی نے امن کو خطرہ میں ڈال دیا ہے اور اگر اس کو لگام نہ دی گئی تو سارا امن عالم خطرہ میں پڑ جائے گا۔ امریکہ کی تازہ ترین غنڈہ گردی ۱۶ اپریل کو لیبیا کے پر امن شہریوں پر حملہ ہے۔ یہ حملہ رات کے سناٹے میں ڈھائی بجے کیا گیا جبکہ تمام شہری گہری نیند میں سو رہے تھے۔ خونخوار ریگن کا یہ اقدام قابل مذمت اور امریکی قوت و طاقت اور جاہ و حشمت کے زوال کا نقطۂ آغاز ہے۔ انشاء اللہ دم توڑتی مغربی تہذیب کے ساتھ اس کا پر شکوہ اقتدار بھی ختم ہو جائے گا۔ مسز تھیچر اور برطانیہ کب تک دوسروں کے سہارے جیتے رہیں گے ان کی موت اب بالکل قریب ہے۔

فروری ۱۹۸۶ء کی پہلی تاریخ کو کائنات ایک لمحہ کے لئے ٹھہر گئی جب یوپی کے چیف منسٹر ویر بہادر سنگھ نے اپنی قوت و طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پولیس فورس، پی اے سی اور نام نہاد آزاد عدلیہ کے ذریعہ صدیوں کی بابری مسجد کو چھین کر اکثریت کے حوالہ کر دیا۔ مسلمانوں کی مجبوری بے کسی، اور بے بسی اور حکومت کے ظلم، جور اور جبر کی انتہا ہو گئی۔ جب اس نے مارا بھی اور رونے بھی نہ دیا۔ خوشیاں بھی منائی اور ریڈیو اور ٹی وی پر مزے بھی لئے اور منہ بھی چڑھایا، پولیس اور پی اے سی نے گولیاں چلائیں۔ قید و بند کیا اور گھروں کی تلاشی لی مسلم ہندوستان کا یہ المناک باب تاریخ کے صفحات میں ویر بہادر سنگھ کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہوگا جس کو وہ دوسرے جنم میں بھی نہ دھو سکیں گے (ان کے عقیدہ کے مطابق) بہتر ہوگا کہ صوبائی اور مرکزی حکومتیں اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں اور بابری مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔ مسلمان اس سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوں گے۔

پیارے رمضان! اب جبکہ تو آ ہی گیا ہے تو پوری دنیا کا ایک چکر لگا لے خصوصاً ہندوستان میں کشمیر چلا جا، آسام کا دورہ کر لے اور یوپی کے در و دیوار پر مسلم خون کا مشاہدہ کر لے اور واپس بابری پر

گواہ رہو کہ ہم نے ہر چیز کا نقصان گوارا کیا اور ہر چیز کو قربانی کے لیے پیش کیا مگر اسلام پر آنچ نہ آنے دی اور اب جبکہ اسلام ہماری جانوں کا نذرانہ مانگ رہا ہے، ہم ان شاء اللہ اسے بھی پیش کریں گے۔ اور ستم کی رات جتنی ہی طویل ہوگی، سروں کے اتنے ہی چراغ جلائیں گے۔

پیارے رمضان! تو گواہ رہ ہمارے خلوص پر، تڑپ پر اور جذبۂ قربانی پر اور ہاں یہ عہد کر کہ تو ہندوستان میں ہر سال آتا رہے گا، قیامت تک۔ زمین و آسمان کے قائم رہنے تک تاکہ تو حالات کا مشاہدہ کر سکے اور قیامت میں گواہی دے سکے۔ الصیام والقرآن یشفعان للعبد یوم القیامۃ. یقول الصیام: ای رب، منعتہ من الطعام والشراب فشفعنی فیہ ویقول القرآن: منعتہ من النوم باللیل فشفعنی فیہ قال: فیشفعان۔

قیامت کے دن رمضان اور قرآن بندے کی شفاعت کریں گے۔ رمضان کہے گا خدایا میں نے اسے کھانے پینے سے روکے رکھا تو اس کے متعلق میری شفاعت قبول کرے اور قرآن کہے گا خدایا میں نے اس کو رات کو بیدار رکھا پس اس کے متعلق میری شفاعت قبول کرے پس ان دونوں کی شفاعت قبول کر لی جائے گی۔"

خدا ہمارا حامی و ناصر ہو

مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی پھر امیر جماعت اسلامی ہند منتخب
نئی میقات کیلئے مرکزی مجلس شوریٰ کا بھی انتخاب

دہلی، ۱۷ اپریل مجلس نمائندگان جماعت اسلامی ہند نے اپنے اجلاس میں، ۱۷ اپریل کو مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی کو آئندہ چار سال کیلئے پھر امیر جماعت منتخب کر لیا۔ نمائندگان کا اجلاس یہاں مرکز جماعت میں ۱۱ اپریل سے جاری تھا۔ مجلس نمائندگان کے نئی چار سالہ میقات کیلئے نئی مرکزی مجلس شوریٰ کیلئے منتخب ہونے والے حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

نمبر شمار - اسمائے گرامی	حلقہ	نمبر شمار - اسمائے گرامی	حلقہ	نمبر شمار - اسمائے گرامی	حلقہ
۱- جناب مولانا ابواحمد صاحب قادری	رامپور	۷- جناب عبدالعزیز صاحب	آندھرا پردیش	۱۳- جناب جلال الدین انصر عمری	علی گڑھ
۲- " صدر الدین اصلاحی	دہلی	۸- " سید یوسف	مرکز	۱۴- " محمد یعقوب گھیلانی	مغربی بنگال
۳- " محمد شفیع مونس	مرکز	۹- " اعجاز احمد اسلم	تمل ناڈو	۱۵- " ... عبداللہ	[illegible]
۴- " کے سی عبداللہ	کیرلا	۱۰- " انعام الرحمن خاں	مدھیہ پردیش	۱۶- " ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ	پٹنہ بہار
۵- " محمد سراج الحسن	مرکز	۱۱- " ڈاکٹر احمد سجاد	بہار	۱۷- " محمود خاں	کرناٹک
۶- " عبدالرشید عثمانی	بمبئی مہاراشٹر	۱۲- " نظام الدین	گجرات	۱۸- " مولانا محمد یوسف اصلاحی	رامپور یوپی

مقبول احمد فلاحی

ملک کی موجودہ صورت حال اور امت مسلمہ کی ذمہ داریاں

جہاں تک ملک کی موجودہ صورت حال کے ظاہری پہلو کا تعلق ہے اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ تمام حالات سب کے سامنے ہیں، ہر شخص نہ صرف تمام حالات کو بچشم سر دیکھ رہا ہے بلکہ صحیح معنوں میں اسے بھگت رہا ہے۔ مہنگائی اگر بڑھتی ہے تو تمام شہری اس سے متاثر ہوتے ہیں بے روزگاری، ارضی و سماوی آفات، بھوک مری، غنڈہ گردی، لاقانونیت، ناانصافی، افراتفری، سیاسی اتھل پتھل، عریانیت، بے حیائی، اخلاقی بے راہ روی، صنعتی ناؤ کی، اقربا پروری، چور بازاری، رشوت ستانی، بلیک مارکٹنگ، استحصال، اونچ نیچ، جھوٹ، یہ اور ایسی بے شمار خرابیاں جو ہمارے ملک میں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان سے ملک کا ہر شہری باخبر ہے اور اسے ان چیزوں سے ہر وقت سابقہ پیش آتا ہے۔

اسی کے ساتھ جو تعمیری اور مثبت پہلو ہیں وہ بھی سب کے سامنے ہیں، ٹی وی، ریڈیو، وی سی آر، ویڈیو، سڑکیں، نہریں، بجلی، باز آبادکاری، منصوبہ بندی، صنعتی اور سائنسی ترقی، ٹکنالوجی کا فروغ، آمدورفت کی سہولیات، بین الاقوامی روابط، اور اسی طرح کی کچھ اور چیزیں جنھیں ملک کے روشن پہلو کی حیثیت سے نہایت فخریہ انداز سے پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی سب کے علم میں ہیں لیکن ترقی کی یہ چیزیں بذات خود ترقی کی ضامن قرار نہیں پا سکتیں بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جن چیزوں کو ترقی کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے وہی منصوبہ ساز اداروں اور صاحب اقتدار کے انداز فکر کی مناسبت سے صفر اور نقصان دہ ہوں، بسا اوقات ظاہری رکھ رکھاؤ ٹھیک اسی مثل کے مصداق ہوتا ہے کہ کسی خوبصورت پیارے پر کوئی قافلہ قیمتی سامان زیست کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہو، اور سامان تعیش کی ریل پیل اور

شراب و شباب میں مگن ہو۔ مگر بہاؤ کی تہ میں کھولتا ہوا لاوا جو کسی آن پھٹ کر پورے تانے بانے کو ملیامیٹ کر دینے والا ہو اس سے اہل قافلہ بے خبر ہوں اور اسی بے خبری اور خود گمگشتگی کے عالم میں آتش فشاں کی زد میں آ کر فنا کے گھاٹ اتر جانے والے ہوں، لہٰذا ملک کی ظاہری صورت حال کی تہ میں جھانک کر دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا وجوہ و اسباب ہیں جن کے برگ و بار اور نتائج کی صورت میں موجودہ حالات نے جنم لیا ہے۔

ذہنی اور فکری غلامی کسی سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ہمارا ملک ایک طویل مدت تک دوسری قوموں کا غلام رہا ہے۔ انگریزوں نے ہمارے ملک پر جہاں سیاسی غلبہ و تسلط حاصل کیا وہیں تہذیب و تمدن، فکر و فلسفہ کی ایسی بنا ڈالی جس نے باشندگان وطن کے قلوب کو مسخر کیا اور انہوں کو غلام بنایا۔ اور اس کے اثرات ہم ہندوستانیوں کی ہر ہر ادا سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جہاد آزادی کے جیالوں کے پیش نظر بھی ملک کو جہاں سیاسی طور پر آزاد کرانا تھا وہیں اہل وطن کو اس غلامی سے بھی نجات دلانا تھا جس نے ان کے فکر و نظر، تہذیب و تمدن کو متاثر کیا تھا۔

اگر یہ دوسری آزادی بھی مقصود تھی تو کیا مجاہدین آزادی کے خوابوں کا بھارت بنایا جا سکا اور کیا آزادی کے بعد عمومی صورتحال میں کچھ تغیر واقع ہوا۔ اور کیا دور غلامی کی بہ نسبت اب ملک زیادہ خوشحال اور یہاں کے شہری زیادہ مطمئن ہیں۔ اور کیا وہ بلند تر مقصد جس کے لئے آزادی کی جنگ لڑی گئی حاصل ہوتا نظر آ رہا ہے؟

ان سوالات کی روشنی میں جب ہم اپنے ملک کی فکری گہرائیوں کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ملک انگریزوں سے ظاہری آزادی حاصل کرنے کے باوجود ان کے فکر و فلسفہ اور نظام حکومت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اب بھی ہم ہندوستانی بدیشی طاقتوں کے کل پرزے کی حیثیت سے ان کے اشارہ چشم و ابرو پر حرکت کرتے ہیں۔

وہ تصور جو بعض خاص تاریخی عوامل کی بنا پر یورپ میں مقبول عام ہوا۔ اور وہاں ایک غلط مفروضے کی بنا پر زندگی کے تمام گوشوں سے مذہب کو بے دخل کر کے ترقی کا خاکہ مرتب کیا گیا ہم ہندوستانیوں نے جو مذہب پر گہرا یقین رکھتے ہیں بڑی آسانی کے ساتھ اس نظریے کو ہضم کر لیا اور مغربی آقاؤں کے فلسفوں کو تنقید سے بالاتر تسلیم کرتے ہوئے ملک کی تعمیر جدید میں خود کو مذہب سے

علیحدہ رکھنے کا اعلان کر ڈالا۔

اسی طرح اشتراکیت کے چکاچوند میں ہماری نگاہیں خیرہ ہو گئیں اور اشتراکی طرز معاشرت کو حرز جان بنا لیا گیا۔ ہماری محبت و تحسین کا دائرہ اس باطل نظریے کی حقیقت سے ہٹ کر صرف اسی بات پر مرکوز رہا کہ اس "نعمت" کو ملک کے مجموعی ڈھانچہ میں کیونکر سمویا جائے۔ پھر تمام صلاحیتیں ایک غلط مفروضے کو عملی جامہ پہنانے میں جھونک دی گئیں۔ اور بالآخر حاکمیت عوام (ڈیموکریسی) کے کھوکھلے اور تباہ کن نعرے پر ڈیرہ ڈال دیا گیا۔ اور اب ساری معرکہ آرائی کا محور مختلف انسانوں کی حاکمیت کی کشاکش بن گئی ہے۔

چنانچہ اس وقت سے لے کر اب تک مختلف باتیں آتی رہیں اور مختلف لوگ مختلف تاویلیں کرتے رہے حتیٰ کہ بعض لوگوں نے ملک کی موجودہ صورتحال کی تمام تر ذمہ داری اس فکر و فلسفہ پر بھی ڈالی ہے جس پر ملک کا اجتماعی نظام قائم ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے، موجودہ نظام حکومت ہی وہ فاسد بیج ہے کہ اس کی آبیاری کی جتنی بھی کوشش کی جائے گی مرض گھٹنے کے بجائے بدیہی طور پر بڑھتا ہی جائے گا۔

جارحانہ نیشنلزم دوسری خاص بات جو ملک کے پردے پر صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اور جو تصور روز بروز واضح تر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ قومی، علاقائی، نسلی، لونی، تہذیبی، لسانی اور مذہبی جارحیت ہے۔

آئے دن علاقائی بنیادوں پر تحریکیں اور جماعتیں وجود میں آتی ہیں اور پھر ایک قوت بن کر ملکی سیاست میں داخل ہو جاتی ہیں۔ دیکھا جائے تو مرکز میں ایک مضبوط حکومت کے باوجود اس وقت مختلف ریاستوں میں علاقائی پارٹیوں کا جو زور ہے شاید آزادی کے بعد سے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ریاستوں میں صوبائی سطح کی تنظیموں کی حکومتیں اسی نیشنلزم کی ثمرات ہیں جس کا نشہ بعض محدود اور عارضی مفادات کے لئے ملکی عوام کو زور و شور کے ساتھ پلایا گیا تھا۔ وطن کا وفادار بنانے کے لئے جن منفی جذبات کو اپیل کیا گیا تھا، اگر یہ سمجھا جائے کہ اس کا دائرہ اسی حد تک محدود رہے گا تو یہ صرف خام خیالی ہوگی۔

اسی طرح ایک زبان، ایک نسل، ایک مذہب اور ایک علاقے اور ریاست کے افراد کو

مظلومی اور محرومی کا خوف یا خوشحالی اور ترقی کا لالچ دے کر جماعتیں بنائی جاتی ہیں اور پھر اس کو فروغ پہنچانے کے لئے دوسری نسلوں، مذاہب، علاقوں اور زبانوں سے نفرت پیدا کرنے کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا جاتا۔ قوم پرستی کے اس منفی طرزِ عمل سے ملک کے ماحول اور سیاست میں جو انتشار، ٹکراؤ اور اتھل پتھل لازمی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

اسی کی ایک نہایت قبیح اور بدترین شکل وہ جنونانہ فرقہ پرستی ہے جو اس وقت پورے ملک میں فضا کو حد درجہ جذباتی اور مسموم کئے ہوئے ہے۔ اکثریتی فرقہ کے ایک محدود طبقہ نے دیگر قوموں کے خلاف کا افسانہ گڑھ کر ملک کو ایک ایسے مقام پر لاکر کھڑا کیا ہے جو ملکی سالمیت کیلئے نہایت سنگین اور باہمی بھائی چارے کے لئے حد درجہ نقصاندہ کہا جا سکتا ہے۔ پنجاب کا کئی سالوں سے چلا آرہا بحران اسی ذہنیت کی پیداوار ہے۔ آسام میں ۸۳ء کے خون آشام واقعات میں اسی کی نحوست کارفرما تھی۔ ملک کے طول و عرض میں ہونے والے روز افزوں ہندو مسلم فسادات اسی کج فکری کا نتیجہ ہیں۔ ہریجنوں اور پسماندہ طبقات پر مظالم اسی ذہنیت کی علامت ہیں اور اب تو یہ جارحانہ نیشنلزم اپنی حدود کو پھلانگ کر ہٹلر اور مسولینی کے فاشزم اور نازی ازم کا ہمدوش ہو گیا ہے۔

پیٹرو ڈالر، توسیع اسلام، رام کی جائے پیدائش کی آزادی جیسے فرضی افسانے تراش کر گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ اور ہر ہر شہر میں رتھ یاترائیں نکالی جا رہی ہیں اور انمیں دھڑلے کے ساتھ نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ "ہندوستان میں رہنا ہے تو بندے ماترم کہنا ہے"، "ہندی، ہندو، ہندوستان"، "بابر کا بدلہ لیں گے بابر کی اولاد سے"، "ابھی تو یہ انگڑائی ہے آگے اور لڑائی ہے"۔ اور حیرت تو اس پر ہے کہ اس ادھموم کی لپیٹ میں نیچے سے اوپر تک وہ تمام لوگ بھی نظر آرہے ہیں جو نہایت بے باکی سے خود کو سیکولر کہتے پھرتے ہیں، شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ اور بابری مسجد میں مندر بنانے کی شرمناک سازش اسکی تازہ ترین مثالیں ہیں۔ ارباب سیاست، قومی اخبارات و رسائل، روشن خیال دانشور مفکرین و مصنفین سب کے سب اس جارحانہ فرقہ پرستی سے مسحور ہو کر عجیب عجیب حرکتیں کرتے نظر آرہے ہیں، یہ بے چارے کسی مصلحت کی بنا پر شیر کی کھال اوڑھ کر عوام کے درمیان

شیر بنے پھر رہے ہیں۔ اور اب خدا جانے کیا مصلحت ان کے سامنے آگئی ہے کہ گیدڑوں کے سر میں سر ملاتے نہیں تھک رہے ہیں۔ اس وقت حکمراں اور اپوزیشن تمام لیڈروں کی کھوکھلاہٹ قابل دید ہے۔ ہر ایک مسلم دشمنی اور ہندو احیاء پرستی میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے میں لگا ہوا ہے۔

حد درجہ تعجب خیز اور افسوسناک وہ نظریہ ہے جو بینہ طور پر بعض عناصر نے اختیار کیا ہے۔ وطن کا کوئی طبقہ اگر اپنا رشتہ مکہ، مدینہ، حضرت محمدؐ، عالم اسلام اور دینی بھائیوں سے جوڑتا ہے اور اس دینی تعلق کی بنا پر اپنی محبت اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے یا بیت اللہ کی طرف رخ کرکے نماز ادا کرتا ہے تو یہ بوالہوس اسے وطن دشمنی اور باہر کی دنیا سے وفاداری قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے خود ملکی نظام کے لئے در در کی گدائی کی ہے اور اب بھی ہر موقع پر واشنگٹن، ماسکو اور لندن ہی سے غذا حاصل کر رہے ہیں۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا اگر یہی صورت حال برقرار رہی اور جارحیت پسند فرقہ پرست تنظیموں کی سرگرمیوں پر پابندی نہ لگائی گئی تو آئندہ ملک کا کیا نقشہ بنے گا۔

مفاد پرستی ہر انسان فطری طور پر نفع کا خواہشمند اور نقصان سے گریزاں ہوتا ہے اور فی نفسہ یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں ہے، لیکن اگر یہ جذبہ اپنے متوازن اور فطری حدود سے متجاوز ہو کر یہ رخ اختیار کرے کہ آدمی کے پیش نظر صرف اور صرف اپنا مفاد ہو، اسکے اس جلب منفعت اور مفاد پرستی کی زد دیگر افراد اور معاشرے پر خواہ کتنی ہی بھیانک اور خطرناک صورت میں کیوں نہ پڑتی ہو، اس کی تمام تر توجہ اپنی ذات، اپنی قوم اور اپنی نسل تک محدود ہو کر رہ جائے۔ جب کہیں یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ وبا عام ہو جاتی ہے تو اس جگہ نفرت، انتقام، استحصال، ذخیرہ اندوزی، طبقاتی کشمکش وغیرہ خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ اور یہ بیماریاں مفاد پرستی کے نتائج کی انتہا نہیں ہوتی ہیں بلکہ پھر اس کے بھی بعض دیگر مہلک اور تباہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

سیاسی دنیا پر نظر ڈالئے تو وہاں خاندانوں میں اقتدار کے ارتکاز کا رجحان دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ دسرا اقتدار پارٹی تو بڑا نام ہے ہی اپوزیشن پارٹیاں بھی وہی رخ اختیار کئے

ہوئے ہیں۔ چار فیصد برہمنوں کا تمام کلیدی مناصب پر قبضہ اسی مفاد پرستی کی دین ہے۔ ام سروپ کی رزائن اور حال میں بیسیوں نمایاں لیڈروں کا بھیس کر دو ملک کے اہم رازوں کا دشمنوں سے سودا اسی ذہنیت کی پوجا کی مرہون منت ہے۔ دلہنوں کا قتل اور ان کی خودکشی، جہیز کی لعنت اور لڑکیوں سے نفرت سب کا رشتہ اسی منحوس جذبے سے جڑا ہوا ہے۔ رجنیش جیسے جنس پرست بھگوانوں کا وجود بھی اسی جذبے سے غذا حاصل کرتا ہے۔ حتیٰ کہ سیاسی لیڈر اور مذہبی پیشوا بھی سماج سیوا اور رفاہ عام کا کام مفادات سے بالاتر ہو کر کرنے کا تصور تک نہیں کرتے غرضیکہ ہر ایک ہر سطح پر ہر کام کی بنیاد عارضی مفاد کے حصول پر ہی رکھ رہا ہے۔

اخلاقی بے راہ روی، اونچ نیچ اور مہنگائی وغیرہ

ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں اخلاقی بے راہ روی جس تیزی کے ساتھ فروغ پا رہی ہے وہ سنجیدہ طبقہ کو پریشان کئے ہوئے ہے ملک کا دور اندیش طبقہ اس کے انجام سے لوگوں کو باخبر بھی کراتا رہتا ہے، قدیم روایات سے ہٹ کر روز بروز جو عریانیت، فحاشی، سینما، ٹی وی کے گندے مناظر، اغوا، زنا بالجبر وغیرہ میں اضافہ کے پیچھے بھی مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کار فرما ہے۔ اصل حقائق سے اغماض کرتے ہوئے ہم ہندوستانیوں نے مغرب کی ترقی کا راز مرد و زن کی مساوات اور عورتوں کی برہنگی کو سمجھ لیا یا مغربی شاطروں نے سمجھا دیا۔ اور پھر آنکھیں بند کئے ہم تباہی کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔

اس طرح آزادی کے بعد سے بظاہر عظیم منصوبوں اور بار بار کی یقین دہانیوں کے باوجود اونچ نیچ اور چھوا چھوت کو ختم نہیں کیا جا سکا اور اسی خود ساختہ فرق مراتب کی بنیاد پر اخبارات میں آئے دن حقیقی انسانی جانوں کے ضائع ہونے اور انسانوں کے مظالم کی داستان الم شائع ہوتی رہتی ہے۔ اس کے پس پردہ وہی جارحانہ نیشنلزم اپنا کرتب دکھا رہا ہے۔ اور اسی ذہنیت کو مذہبی تقدس مزید تقویت دیتا ہے۔ بالخصوص وہ تصورات جو اہی چھوا چھوت اور اونچ نیچ پر قائم ہیں۔ بعینہٖ مہنگائی ہمارے ملک کا ایک مستقل اور اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اشیاء ضرورت کی قیمتوں میں اضافہ کا رجحان دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ وسائل مائل بزوال ہیں، افراط زر کے بحران کی وجہ سے روپیہ کی قیمت روز افزوں گرتی جا رہی ہے۔ بے روزگاری جو خود بہت سے جرائم کی جڑ ہے اس میں خطرناک اضافہ ہو رہا ہے۔ اس صورت حال کے پیچھے یہ دلیل

بالکل بے وزن ہے کہ ملک کے وسائل ہی محدود ہیں۔ اور وسائل کی بہ نسبت آبادی کے اضافہ کا رجحان بڑھا ہوا ہے۔ دراصل یہ دانشوروں کی خود فریبی ہے یا عوام کو فریب دینا ہے ورنہ وسائل اور زمین کی زرخیزی کے اعتبار سے ہمارا ملک دنیا کے ان ممالک میں ہے جن کا شمار صف اول میں ہوتا ہے، لیکن کیا اسے دولت کی پرستش اور مفاد پرستی کا کرشمہ کے علاوہ کوئی اور نام دیا جا سکتا ہے۔

امت مسلمہ کی ذمہ داریاں

امت مسلمہ کو اپنی ذمہ داریوں پر غور کرتے وقت سب سے پہلے اپنی حیثیت کو سمجھنا چاہئے اور حیثیت کا عرفان ہی دراصل ذمہ داریوں کو سمجھ لینا ہے۔

قرآن میں حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی دعا میں یہ لفظ آیا ہے

ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک (البقرہ ۱۲۸)

ترجمہ:- اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔ گویا امت مسلمہ سے مراد وہ گروہ ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کرنے والا اور جو حفاظت زندگی میں اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے والا ہو۔ قرآن میں ایک دوسری خوبصورت نام سے نوازا گیا ہے۔ وکذالک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا (البقرہ ۱۴۳)

اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔ امت وسط کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودی علیہ الرحمہ تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں۔ "امت وسط کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ و اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو۔ جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔"

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو عام طور پر امت اور اردو زبان

ہیں" دنیا "قوم" کو ہم معنی قرار دے دیا جاتا ہے۔ دراصل ایک رسول کی بعثت کے بعد اس کی دعوت جن جن لوگوں تک پہنچی وہ سب اس کی امت ہوتے ہیں۔

اس طرح امت مسلمہ اور امت وسط کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو حضور کی رسالت پر ایمان لائے۔ آپ کی تعلیمات کو قبول کیا، اس پر عمل پیرا ہوئے اور پھر اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے میں لگ گئے۔

شہادت حق

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ملک کی جو بھی صورت حال ہے جس کا سرسری خاکہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے اس کی زیادہ تر ذمہ داری امت مسلمہ پر ہے۔ اگر ہمارا ملک ظاہری آزادی حاصل کر لینے کے باوجود دنیا کی دیگر قوموں اور ملکوں کا ذہنی، فکری اور نظریاتی غلامی میں مبتلا ہے تو اس سانحے میں ملک میں بسنے والے برادران وطن کا زیادہ قصور نہیں ہے کیونکہ وہ بیچارے اپنی کم مائیگی کی بنا پر دوسروں کے غلام رہنے پر مجبور ہیں۔ کسی طبقہ گروہ یا مذہبی اکائی کے پاس کوئی ایسا نظریہ یا نظام حیات نہیں ہے جو ملک کو دوسروں کی غلامی سے بے نیاز کر سکے۔ ہندو میتھالوجی کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے۔ وہ اچھی طرح سے واقف ہونگے کہ اسکا بیشتر حصہ دیومالائی قصے کہانیوں، اخلاق باختہ واقعات کچھ رسوم و رواج اور چند پوجا پاٹ کے طریقے کا نام ہے۔ اس کے اندر نظام مملکت چلانے اور معاشی، معاشرتی اور سماجی امور میں رہنمائی دینے کی صلاحیت تو درکنار عام انسانی اخلاقیات میں بھی واضح بات نہیں ملتی۔ ایسی صورت میں ملک کی اکثریت دست گدائی دراز کرتی ہے، اور جہاں کہیں کچھ مل جاتا ہے اسے متاع گراں سمجھ کر اپنے سینے سے چپٹا لیتی ہے، تو کیا عجب ہے، اسے تو ایسا کرنا ہی چاہئے۔ یہی معاملہ سکھوں، عیسائیوں، پارسیوں اور دوسرے فرقوں کا بھی ہے۔ یہ لوگ الگ الگ مذاہب ضرور رکھتے ہیں، ان کے کچھ معتقدات اور پوجا پاٹ کے طریقے بھی ہیں۔ نجی زندگی کے لئے کچھ روایات، و رسوم بھی حامل ہیں تاہم ملکی نظام چلانے، سیاسی، سماجی، معاشی اور عدالتی رہنمائی فراہم کرنے، صالح معاشرہ اور ترقی یافتہ اسٹیٹ تشکیل دینے اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دینے اور اسے نافذ العمل کرانے میں اول الذکر سے کچھ مختلف نہیں ہیں۔ اب اگر یہ لوگ وسیع تر تمدنی اور معاشرتی معاملات میں خوشہ چینی نہ کریں تو پھر راستہ ہی کیا ہے۔

ہاں اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ جب دوسروں کے فکر و فلسفہ سے استفادہ کرنا ناگزیر ہی تھا تو پہلے ملک کے اندر موجود افکار و نظریات تہذیب و تمدن پر نظر ڈالی چاہئے اور جب ملک کے اندر ہی بہترین اور مکمل نظام حیات موجود تھا، اور جو اپنے پیچھے ایک قابل فخر تاریخ بھی رکھتا تھا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جن دشمنان وطن کو زبردستی ملک بدر کیا گیا تھا پھر انہی کے در پر بھکاری بن کر حاضر ہوا جاتا۔ اور وہ اسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو الٹا سیدھا چاہتے ہیں پڑھا دیتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں اپنی بالادستی برقرار رکھنے کیلئے ڈال بھی دیتے ہیں۔ اور یہ صورت اس وقت اور زیادہ ناقابل فہم اور تشویشناک ہو جاتی ہے جبکہ اس جامع نظریہ حیات کا حامل ایک مختصر گروہ ہو جو برابر زور لگا رہا ہو اور اہل وطن کو غور و فکر اور تحقیق و مطالعہ کی دعوت دے رہا ہو۔ مسلمانان ہند کی تمام تر خرابیوں کے باوجود آزادی کے وقت سے اب تک ایک ایسے گروہ کا موجود رہنا اور برابر قول و عمل سے حق کی گواہی دیئے جانا، اور جواب میں سرد مہری اور عدم توجہی کا رویہ اختیار کرنا ملک کی بدقسمتی ہی کہی جا سکتی ہے۔

تاہم امت مسلمہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتی کہ اہل وطن کا قصور کم اور من حیث الجماعت امت کا قصور زیادہ ہے۔ امت کے پاس خدا کی عظیم امانت تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے منصب خلافت پر مامور تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین پاک اسوہ تمام دلفریبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود تھا۔ شہادت حق، اعلاء کلمۃ اللہ، اقامت دین اور احیائے اسلام بطور فرض ان پر عائد تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس فریضے کو ادا کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے۔ قول و عمل سے اہل وطن کے سامنے اسلام کی حقانیت ثابت کر دیتے اور اس کے ذریعہ دنیا اور آخرت کی کامیابیوں سے ہمکنار ہوتے۔

مگر بصد افسوس اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ امت کی اکثریت اپنے عمل سے یہ ثابت کر رہی ہے کہ دنیا کی دیگر قوموں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ رذائل اخلاق میں معاصر قوموں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ اور یہ حال صرف عملی شہادت کا نہیں ہے قولی شہادت کا حال تو اور بھی عجیب ہے۔ اب تک اس امت کی بہت بڑی تعداد جسمیں

علماء بھی شامل ہیں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اسلام مکمل نظام حیات اور انسانیت کی ہمہ جہتی فلاح کا ضامن ہے۔ مختلف تاریخی عوامل نے کم ہمتی اور ذہنی پستی میں مبتلا کر دیا ہے۔ دیگر مذاہب کی طرح یہاں بھی دین کو مسجدوں اور نکاح طلاق کے رسومات تک محدود کر دیا ہے۔ جب فکر اتنی کوتاہ اور تنگ ہو تو شہادت حق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

فریضہ اقامت دین کی ادائیگی موجودہ حالات سے مشروط نہیں ہے۔ بلکہ ہر وقت اور ہر حال میں امت کو یہ کام انجام دینا ہے۔ نہ کرنے کی صورت میں دنیا جہنم زار ہوگی اور مرنے کے بعد خدا کے حضور مجرمین کی صف میں شامل ہونا پڑے گا۔ اور اسی شہادت حق کی شاہ کلید سے دنیوی مشکلات اور ملی مسائل کا حل بھی نکل سکتا ہے۔ اس طریقے کو چھوڑ کر کسی دوسرے ذریعے سے ملی مسائل ہرگز حل نہیں کئے جا سکتے۔

اصلاح حال اور متحدہ کوشش ہندو احیاء پرستی کے فرضی نعرے کے تحت جارحانہ فسطائیت نے ملک کے کونے کونے میں جو طوفان برپا کر رکھا ہے اس کی لپیٹ میں زیادہ تر مسلمان ہی آئے ہیں۔ بعض تاریخی عوامل، شرپسندوں کے گندے پروپیگنڈے اور مسلمانوں کے مجموعی کردار کی بنا پر دن بدن برادران وطن کے اندر مسلمانوں سے دوری بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یہ دوری، نفرت، فساد، تشدد، جان و مال کے اتلاف، تہذیب و تمدن پر یلغار، اسلامی قوانین اور مساجد پر ناجائز قبضہ جیسی دوسری شکل میں منظر عام پر آتی ہے۔

اس کشیدگی اور نفرت کی فضا کو دور کرنے، اور اپنے لئے سازگار حالات بنانے اور اپنا تشخص برقرار رکھنے کا بھی بنیادی طریقہ وہی ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

دعوت الی اللہ، حسن اخلاق، پاکیزہ کردار، حسن معاشرت اور تعمیری اور پرامن کوششوں ہی سے یہ خلیج پر ہو سکتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔ (حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی) سورہ انفال میں اللہ تعالیٰ پچھلی امتوں کی ہلاکت اور بربادی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ذالک بان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم (ترجمہ: یہ اللہ کی اس سنت

کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے اس قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی)

معلوم ہوا کہ اگر ہندوستان کا ماحول مسلمانوں کے لئے زنبور خانہ بن گیا ہے، جان و مال، عزت و آبرو، معابد اور مساجد خطرے میں ہیں تو سب سے پہلی ذمہ داری خود اپنی قرار پاتی ہے۔ لہٰذا اگر موجودہ صورتحال سے نکلنا ہے، عزت و سرخروئی حاصل کرنی ہے اپنی مادی اور معنوی وجود کو برقرار رکھنا ہے تو سب سے پہلے اپنے کردار کو سنوارنا ہوگا۔ اپنے آپ کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ مالک حقیقی کو خوش کرنا ہوگا۔ خدائی فرمان کے بموجب اصلاح حال کے بغیر یہ مسائل ہرگز ہرگز حل نہیں ہو سکتے۔

ملی جدوجہد کی طرف پیش قدمی میں بنیادی اہمیت ملت کے اتحاد اور یگانگت کو حاصل ہے۔ شاید اندرونی نااتفاقی اور افتراق ہی غضب خداوندی کے نزول کی وجہ بنی ہے۔ لہٰذا تمام مسلمانوں کو باہم آپسی اختلافات کو ختم کرکے ایک جان ہو جانا چاہئے۔ فروعی اور مسلکی اختلافات کو وہ اہمیت نہیں دینی چاہئے جو ملت کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دے۔ خدائی تنبیہ کو سمجھ کر باطل کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ڈٹ جانا چاہئے۔ اسلام دشمن طاقتیں بھی ملت کے اس اتحاد سے لرزہ براندام ہوں گی اور جو تھوڑی بہت یگانگت کی فضا بن چلی ہے اس کو برباد کرنے کی خفیہ سازشیں بھی کی جاری ہوں گی بہر حال ان سب امکانات کو نظر میں رکھتے ہوئے عوام و خواص سب کو اتحاد و یکجہتی کی طرف پیش قدمی کرنی چاہئے۔

(بقیہ جامعہ کے لیل و نہار)

جنوری کے آخر میں صدر انجمن جناب نسیم احمد غازی علی گڑھ تشریف لائے۔ موصوف انجمن کی جانب سے دیے جانے والے وظائف کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے کوئی عمومی میٹنگ نہ رکھی جا سکی۔

انجمن طلبہ قدیم کی شوریٰ کا اجلاس ۲۳ر اپریل ۱۹۸۶ء بعد نماز عشاء شروع ہوا۔ انجمن کے بہت سے مسائل زیر غور آئے اور ان کے حل کرنے کی راہیں نکالی گئیں۔

(امام عصر مولانا مودودیؒ)

روزہ کا اصل مقصد

برادران اسلام! ہر کام جو انسان کرتا ہے اس میں دو چیزیں لازمی طور پر ہوا کرتی ہیں۔ ایک چیز تو وہ مقصد ہے جس کے لئے کام کیا جاتا ہے اور دوسری چیز اس کام کی وہ خاص شکل ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ مثلاً کھانا کھانے کے فعل کو لیجئے۔ کھانے سے آپ کا مقصد زندہ رہنا اور جسم کی طاقت کو بحال رکھنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ نوالے بناتے ہیں، منہ میں لے جاتے ہیں، دانتوں سے چباتے ہیں اور حلق کے نیچے اتارتے ہیں۔ چونکہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ کارگر اور سب سے زیادہ مناسب طریقہ یہی ہو سکتا تھا اس لئے آپ نے اسی کو اختیار کیا لیکن آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اصل چیز وہ مقصد ہے جس کے لئے کھانا کھایا جاتا ہے۔ نہ کہ کھانے کے فعل کی یہ صورت۔ اگر کوئی شخص لکڑی کا برادہ یا راکھ یا مٹی لے کر اس کے نوالے بنائے اور منہ میں لے جائے اور دانتوں سے چبا کر حلق سے نیچے اتار لے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ اس کا دماغ خراب ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ احمق کھانے کے اصل مقصد کو نہیں سمجھتا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ بس فعل خوردن کے ان چاروں ارکان کو ادا کر دینے ہی کا نام کھانا کھانا ہے۔ اسی طرح آپ اس شخص کو بھی پاگل قرار دیں گے جو روٹی کھانے کے بعد فوراً ہی حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتا ہو اور پھر شکایت کرتا ہو کہ روٹی کھانے کے جو فائدے بیان کئے جاتے ہیں وہ مجھے حاصل ہی نہیں ہوتے بلکہ میں تو الٹا روز بروز دُبلا ہوتا جا رہا ہوں اور مر جانے کی نوبت آ گئی ہے۔ یہ احمق اپنی اس کمزوری کا الزام روٹی اور کھانے پر رکھتا ہے حالانکہ حماقت اس کی اپنی ہے۔ اس نے اپنی نادانی سے یہ سمجھ لیا کہ کھانے کا فعل جتنے ارکان سے مرکب ہے بس ان کو ادا کر دینے ہی سے زندگی کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس نے سوچا کہ اب روٹی کا بوجھ اپنے معدے میں کیوں رکھوں، اسے نکال پھینکا جائے تاکہ پیٹ ہلکا ہو جائے کھانے کے ارکان تو میں ادا کر ہی چکا ہوں۔ لہٰذا یہ

خیال جو اس نے قائم کیا اور پھر اس کی پیروی کی۔ اس کی سزا بھی تو آخر اسی کو بھگتنی چاہئے اسکو جاننا چاہئے تھا کہ جب تک روٹی پیٹ میں جاکر ہضم نہ ہو اور خون بن کر سارے جسم میں پھیل نہ جائے، اس وقت تک زندگی کی طاقت حاصل نہیں ہو سکتی۔ کھانے کے ظاہری ارکان بھی اگرچہ ضروری ہیں کیونکہ ان کے بغیر روٹی معدے تک نہیں پہنچ سکتی، مگر محض ان ظاہری ارکان کے ادا کر دینے سے کام نہیں چل سکتا۔ ان ارکان میں کوئی جادو بھرا نہیں ہے کہ انھیں ادا کرنے سے بس طلسماتی طریقہ پر آدمی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہو۔ خون پیدا کرنے کے لئے تو اللہ نے جو قانون بنایا ہے اسی کے مطابق وہ پیدا ہوگا اس کو توڑو گے تو اپنے آپ کو خود ہلاک کرو گے۔

یہ مثال جو اس تفصیل کے ساتھ میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے اس پر آپ غور کریں تو آپ کی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ آج آپ کی عبادتیں کیوں بے اثر ہو گئی ہیں؟ جیسا کہ میں پہلے بھی آپ سے بارہا بیان کر چکا ہوں سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ آپ نے نماز روزے کے ارکان اور ان کی ظاہری صورتوں ہی کو اصل عبادت سمجھ رکھا ہے اور آپ اس خیال خام میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ جس نے یہ ارکان پوری طرح ادا کر دیئے، اس نے بس اللہ کی عبادت کر دی۔ آپ کی مثال اسی شخص کی سی ہے جو کھانے کے چاروں ارکان یعنی نوالے بنانا، منہ میں رکھنا، چبانا، حلق سے نیچے اتار دینا، بس انہی چاروں کے مجموعے کو کھانا سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ جس نے یہ چار ارکان ادا کر دیئے اس نے کھانا کھا لیا اور کھانے کے فائدے اس کو حاصل ہونے چاہئے، خواہ اس نے ان ارکان کے ساتھ مٹی اور پتھر اپنے پیٹ میں اتارے ہوں یا روٹی کھا کر فوراً قے کر دی ہو۔ اگر آپ لوگ حقیقت میں اس حالت میں مبتلا نہیں ہو گئے ہیں تو مجھے بتائیے یہ کیا ماجرا ہے کہ جو روزہ دار صبح سے شام تک اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے وہ عین اس عبادت کی حالت میں جھوٹ کیسے بولتا ہے؟ غیبت کس طرح کرتا ہے؟ بات بات پر لڑتا کیوں ہے؟ اس کی زبان سے گالیاں کیوں نکلتی ہیں؟ وہ لوگوں کا حق کیسے مار کھاتا ہے؟ حرام کھانے اور حرام کھلانے کا کام کس طرح کر لیتا ہے؟ اور پھر یہ سب کام کر کے بھی اپنے نزدیک یہ کیسے سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کی عبادت کی ہے؟ کیا اس کی مثال اس شخص کی سی نہیں ہے جو راکھ اور مٹی کھاتا ہے اور محض کھانے کے چار ارکان ادا کر دینے کو سمجھتا ہے کہ کھانا اسی کو کہتے ہیں۔

پھر مجھے بتائیے یہ کیا ماجرا ہے کہ رمضان بھر میں تقریباً ۳۰۰ گھنٹے خدا کی عبادت کرنے کے بعد جب آپ فارغ ہوتے ہیں تو اس پوری عبادت کے تمام اثرات شوال کی پہلی تاریخ ہی کو کافور ہو جاتے ہیں؟ ہندو اپنے تہواروں میں جو کچھ کرتے ہیں وہی سب آپ عید کے زمانے میں کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ شہروں میں تو عید کے روز بدکاری اور شراب نوشی اور قماربازی تک ہوتی ہے اور بعض ظالم تو میں نے ایسے دیکھے ہیں جو رمضان کے زمانے میں دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو شراب پیتے ہیں اور زنا کرتے ہیں۔ عام مسلمان خدا کے فضل سے اس قدر بگڑے ہوئے تو نہیں ہیں مگر رمضان ختم ہونے کے بعد آپ میں سے کتنے ایسے ہیں جن کے اندر عید کے دوسرے دن بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کا کوئی اثر باقی رہ جاتا ہو؟ خدا کے قوانین کی خلاف ورزی میں کون سی کسر اٹھا رکھی جاتی ہے؟ نیک کاموں میں کتنا حصہ لیا جاتا ہے؟ اور نفسانیت میں کیا کمی آجاتی ہے؟

سوچئے اور غور کیجئے کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں عبادت کا مفہوم اور مطلب ہی غلط ہو گیا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سحر سے لے کر مغرب تک کچھ نہ کھانے اور نہ پینے کا نام روزہ ہے اور بس یہی عبادت ہے۔ اس لئے روزے کی تو آپ پوری حفاظت کرتے ہیں۔ خدا کا خوف آپ کے دل میں اس قدر ہوتا ہے کہ جس چیز میں روزہ ٹوٹنے کا ذرا سا اندیشہ بھی ہو اس سے بھی آپ بچتے ہیں۔ اگر جان پر بھی بن جائے تب بھی آپ کو روزہ توڑنے میں تامل ہوتا ہے لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ یہ بھوکا پیاسا رہنا اصل عبادت نہیں ہے بلکہ عبادت کی صورت ہے، اور یہ صورت مقرر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ آپ کے اندر خدا کا خوف اور خدا کی محبت پیدا ہو، اور آپ کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ جس چیز میں دنیا بھر کے فائدے ہوں مگر خدا ناراض ہوتا ہو اس سے اپنے نفس پر جبر کر کے بچ سکیں، اور جس چیز میں ہر طرح کے خطرات اور نقصانات ہوں مگر خدا اس سے خوش ہوتا ہو اس پر آپ اپنے نفس کو مجبور کر کے آمادہ کر سکیں۔ یہ طاقت اسی طرح پیدا ہو سکتی تھی کہ آپ روزے کے مقصد کو سمجھتے اور مہینہ بھر تک آپ نے خدا کے خوف اور خدا کی محبت میں اپنے نفس کو خواہشات سے روکنے

اور خدا کی رضا کے مطابق چلانے کی جو مشق کی ہے اس سے کام لیتے۔ مگر آپ تو رمضان کے بعد ہی اس مشق کو اور ان صفات کو جو اس مشق سے پیدا ہوتی ہیں اس طرح نکال پھینکتے ہیں جیسے کھانے کے بعد کوئی شخص حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دے، بلکہ آپ میں سے بعض لوگ تو روزہ کھولنے کے بعد ہی دن بھر کی پرہیزگاری کو اگل دیتے ہیں۔ پھر آپ ہی بتلائیے کہ رمضان اور اس کے روزے کوئی طلسم تو نہیں ہیں کہ بس ان کی ظاہری شکل پوری کر دینے سے آپ کو وہ طاقت حاصل ہو جائے جو حقیقت میں روزے سے حاصل ہونی چاہئے۔ جس طرح روٹی سے جسمانی طاقت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ معدے میں جا کر ہضم نہ ہو اور خون بن کر جسم کی رگ رگ میں نہ پہنچ جائے اسی طرح روزے سے بھی روحانی طاقت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آدمی روزہ کے مقصد کو پوری طرح سمجھے نہیں اور اپنے دل و دماغ کے اندر اس کو اترنے اور خیال، نیت، ارادے اور عمل سب پر چھا جانے کا موقع نہ دے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کا حکم دینے کے بعد فرمایا: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، یعنی تم پر روزہ فرض کیا جاتا ہے، شاید کہ تم متقی و پرہیزگار بن جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس سے ضرور متقی و پرہیزگار بن جاؤ گے۔ اس لئے کہ روزے کا یہ نتیجہ تو آدمی کی سمجھ بوجھ اور اس کے ارادے پر موقوف ہے۔ جو اس کے مقصد کو سمجھے گا اور اس کے ذریعے سے اصل مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ تھوڑا یا بہت متقی بن جائے گا، مگر جو مقصد ہی کو نہ سمجھے گا اور اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کرے گا اسے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید نہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے روزے کی اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ سمجھایا ہے کہ مقصد سے غافل ہو کر بھوکا پیاسا رہنا کچھ مفید نہیں۔ چنانچہ فرمایا: مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ۔

جس کسی نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا ہی نہ چھوڑا تو اس کا کھانا اور پانی چھڑا دینے کی اللہ کو کوئی حاجت نہیں۔

دوسری حدیث میں ہے کہ سرکارؐ نے فرمایا:

كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الظَّمَأُ وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهَرُ۔

بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور بہت سے راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں کہ اس قیام سے رت جگے کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

ان دونوں حدیثوں کا مطلب بالکل صاف ہے۔ ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ محض بھوکا اور پیاسا رہنا عبادت نہیں ہے بلکہ اصل عبادت کا ذریعہ ہے اور اصل عبادت ہے خوف خدا کی وجہ سے خدا کے قانون کی خلاف ورزی نہ کرنا اور محبت الٰہی کی بنا پر اس کام کے لئے شوق سے لپکنا جس میں محبوب کی خوشنودی ہو اور نفسانیت سے بچنا جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اس عبادت سے جو شخص غافل رہا اس نے خواہ مخواہ اپنے پیٹ کو بھوک پیاس کی تکلیف دی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت کب تھی کہ بارہ چودہ گھنٹے کے لئے اس سے کھانا پینا چھڑا دیتا؟

روزے کے اصل مقصد کی طرف سرکارؐ اس طرح توجہ دلاتے ہیں کہ:

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ۔

یعنی جس نے روزہ رکھا ایمان اور احتساب کے ساتھ اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے۔

ایمان کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے متعلق ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہئے وہ عقیدہ ذہن میں پوری طرح تازہ رہے۔ اور احتساب کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ ہی کی رضا کا طالب ہو اور ہر وقت اپنے خیالات اور اپنے اعمال پر نظر رکھے کہ کہیں وہ اللہ کی رضا کے خلاف تو نہیں چل رہا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ جو شخص رمضان کے پورے روزے رکھ لے گا وہ اپنے پچھلے گناہ بخشوا لے جائے گا۔ اس لئے اگر وہ کبھی سرکش و نافرمان بندہ تھا بھی تو اب اس نے اپنے مالک کی طرف پوری طرح رجوع کر لیا۔ اور اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ تھا)۔

دوسری حدیث میں آیا ہے:

اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ وَإِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ أَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَإِنْ سَابَّهُ أَحَدٌ أَوْ قَاتَلَهُ فَلْيَقُلْ إِنِّي امْرُؤٌ صَائِمٌ۔

روزے ڈھال کی طرح ہیں (کہ جس طرح ڈھال دشمن کے وار سے بچنے کے لئے ہے اسی طرح روزہ بھی شیطان کے وار سے بچنے کے لئے ہے لہٰذا جب کوئی شخص روزے سے ہو تو اسے چاہئے کہ (اس ڈھال کو استعمال کرے اور) دنگے فساد سے پرہیز کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑے تو اس کو کہہ دینا چاہئے کہ بھائی میں روزے سے ہوں (مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمہارے اس شغلے میں حصہ لوں گا)۔

دوسری احادیث میں حضورؐ نے بتایا ہے کہ روزے کی حالت میں آدمی کو زیادہ سے زیادہ نیک کام کرنے چاہئیں اور ہر بھلائی کا شوقین بن جانا چاہئے۔ خصوصاً اس حالت میں اس کے اندر اپنے دوسرے بھائیوں کی ہمدردی کا جذبہ تو پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو جانا چاہئے کیونکہ وہ خود بھوک پیاس کی تکلیف میں مبتلا ہو کر زیادہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دوسرے بندگان خدا پر غریبی اور مصیبت میں کیا گزرتی ہوگی۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ خود سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں عام دنوں سے زیادہ رحیم و شفیق ہو جاتے تھے۔ کوئی سائل اس زمانے میں حضورؐ کے دروازے سے خالی نہ جاتا تھا اور کوئی قیدی اس زمانے میں قید نہ رہتا تھا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

مَنْ فَطَّرَ فِيهِ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةً لِذُنُوبِهِ وَعِتْقَ رَقَبَتِهِ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْتَقِصَ مِنْ أَجْرِهِ شَيْءٌ۔

جس نے رمضان میں کسی روزہ دار کو افطار کرایا تو یہ اس کے گناہوں کی بخشش کا اور اس کی گردن کو آگ سے چھڑانے کا ذریعہ ہوگا اور اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس روزہ دار کو روزہ رکھنے کا ثواب ملے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی ہو۔

* * *

محمد مسعود عالم القاسمی
ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

کیا ابوبکر صدیقؓ سخت گیر تھے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ مشہور صحابی رسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ نرم مزاج، سنجیدہ طبیعت، اور بردبار واقع ہوئے تھے، انہی خصوصیات کی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ارحم امتی یا امتی ابوبکرؓ کے خطاب سے نوازا تھا مگر جب یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی طبیعت میں نرمی ہی نرمی تھی تو عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہر حال میں ہر موقع پر اور ہر شخص کے تئیں ان کی جانب سے نرمی کا ہی مظاہرہ ہوتا تھا اور سختی نام کی کوئی چیز ان کے اندر موجود نہ تھی جبکہ یہ قطعی ضروری نہیں کہ ایک شخص اگر طبعاً سخت گیر ہو تو وہ ہر حال میں سخت گیری کا ہی مظاہرہ کرے اور کسی کی طبیعت میں نرمی ہو تو سختی سے وہ کبھی کام ہی نہ لے بلکہ سچ پوچھئے تو صرف سختی یا صرف نرمی شخصیت کے نقص کی علامت ہوتی ہے ایک مکمل شخصیت کے لئے نرم اور گرم حسب موقع دونوں کا ہونا ضروری ہے علامہ اقبال مومن کی تعریف یوں کرتے ہیں:

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم ؎ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرتے وقت یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت کی بردباری اور مزاج کی انکساری کے باوجود حسب موقع سختی سے بھی کام لیا کرتے تھے، بلکہ بعض حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "ابوبکر صدیقؓ کی ظاہری نرمی کی تہہ میں ایک سختی مضمر تھی، عام حالات میں ایک نرم مزاج آدمی کو سختی سے کام لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی مگر جب اس کی جان و مال عزت و آبرو عہدہ و اقتدار اور دیگر چیزوں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ سخت سے سخت تر اقدام کر گذرنے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتا چنانچہ ہندوستان کے رحم دل اور نرم مزاج بادشاہ سلطان جلال الدین خلجی کے سامنے جب سیدی مولہ کا معاملہ آیا تو اس کی نرمی اور درگذر والا جذبہ کافور ہوگیا اور معاملہ سیدی مولہ جیسے درویش کے قتل تک پہنچا۔ یہی معاملہ تقریباً ہر دور

کا ہوتا ہے وہ اپنے ایمان، معتقدات، اور دین حق کے خلاف ذرا سی حرکت برداشت نہیں کرتا ایسے موقع پر وہ اپنی نرمی ایک طرف رکھ دیتا ہے اور طوفان بلاخیز بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسی سلسلہ کے چند واقعات ابوبکر صدیقؓ کی سیرت سے ملاحظہ کیجئے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ یہودیوں کے "بیت المدراس" میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ بہت سارے یہودی "فنحاص" نامی ایک شخص کے ارد گرد جمع ہیں، وہ یہودیوں کا عالم اور فقیہ تھا اس کے ساتھ ایک دوسرا عالم بھی فنحاص کا نام "اشیع" تھا۔ ابوبکرؓ نے کہا اے فنحاص تیرا ناس ہو تم خدا سے ڈرو اور اسلام قبول کر لو، خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور وہ تمہارے پاس حق لے کر آئے ہیں ان کا تذکرہ تم توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہو۔ فنحاص نے جواب دیا، خدا کی قسم اے ابوبکرؓ ہمیں تمہارے خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم اس کے محتاج نہیں ہیں بلکہ وہ ہمارا محتاج ہے، ہم اس کے سامنے نہیں گڑگڑاتے جس طرح وہ ہمارے سامنے گڑگڑاتا ہے، ہم اس کے مقابلہ میں مالدار ہیں اور وہ ہمارے مقابلہ میں نادار ہے اگر وہ ہم سے زیادہ مالدار ہوتا تو ہم سے قرض نہ مانگتا جیسا کہ تمہارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ:

"اللہ کو قرض دو قرض حسنہ تاکہ وہ تمہیں بڑھا چڑھا کر لوٹائے۔"

وہ تمہیں تو سود لینے سے روکتا ہے مگر ہمیں سود دیتا ہے اگر مالدار ہوتا تو ہمیں سود نہ دیتا۔ اتنا سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ کو غصہ آگیا اور فنحاص کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا اور کہا خدا کی قسم اے دشمن خدا اگر ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن اڑا دیتا تمہارے بس میں جہاں تک ہو تو ہم لوگوں کو جھوٹا ثابت کرو اگر تم واقعی سچے ہو۔ (۲)

بات صرف یہ تھی کہ اس یہودی عالم نے قرآن کا مذاق اڑایا تھا اور اللہ کے دین کی توہین کی مگر یہ اس متحمل اور بردبار انسان پر اتنی گراں گذری کہ اس یہودی عالم کے منہ پر شاید وہ طمانچہ بھی اتنا گراں نہ گذرا ہوگا۔

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کی سختی اس وقت دیکھنے میں آئی جب حضور اکرمؐ کا وصال ہوگیا اور ابوبکرؓ نے اسامہ بن زید کو سالار کارواں بنا کر لشکر محاذ جنگ پر روانہ کر دیا اور مدینہ میں وصال نبی سے جو افراتفری مچ گئی تھی اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ کبار صحابہؓ جن کی ترجمانی

حضرت عمر فاروقؓ نے ان کا کہنا تھا کہ اسامہ بن زید کی جگہ کسی عمر رسیدہ صحابی کو کمانڈر بنایا جائے اس پر ابوبکرؓ کا یہ حال تھا کہ مارے غصہ کے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ غصہ کی وجہ یہ تھی جیسا کہ انھوں نے فرمایا "اے عمر! اسامہ کو آنحضورؐ نے کمانڈر بنایا تھا اور تم مجھ سے کہتے ہو کہ اسے معزول کر دوں۔" (۳)

ابوبکر صدیقؓ کی سخت گیری کا عبرتناک موقع وہ تھا جب حضورؐ کی وفات کی خبر سن کر کچے عقیدہ کے لوگ بھاری تعداد میں اسلام سے برگشتہ ہو گئے اور کچھ لوگ اسلام سے تو نہ پھرے لیکن زکوٰۃ ادا کرنے سے علانیہ انکار کر دیا۔ اس پر ابوبکرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ اسلام سے پھرنے والوں کی طرح زکوٰۃ نہ دینے والوں سے بھی جنگ کی جائے مگر دوسرے صحابہ کی یہ رائے بالکل نہ تھی اور حضرت عمرؓ نے تو صاف کہا تھا کہ آپ مانعین زکوٰۃ سے کیسے جنگ کر سکتے ہیں جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھے حکم ہے کہ میں ان لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں اور جس نے اس کلمہ کا اقرار کیا تو میری طرف سے اس کی جان و مال محفوظ ہے مگر بحق نفس اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔"

اس پر حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم میں تو ان لوگوں سے ضرور جنگ کروں گا جنھوں نے نماز اور زکوٰۃ میں فرق کیا کیونکہ زکوٰۃ حق مال ہے، بخدا اگر ان لوگوں نے اونٹ باندھنے کی رسی بھی دینے سے انکار کیا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے تو میں ضرور ان لوگوں سے جنگ کروں گا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا "اجبار فی الجاھلیۃ خوار فی الاسلام۔ یہ کیا ہے کہ تم کفر کی حالت میں تو بڑے بہادر اور اسلام میں آ کر بزدل ہو گئے۔" (۴)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سخت گیری کا اندازہ لگانے کے لئے ان فرامین کا مطالعہ بھی موزوں ہے جو انھوں نے بغاوت، راہزنی، مرتدین اور دوسرے فاجروں کے حق میں صادر فرمائے تھے مثلاً انھوں نے خالد بن ولید کو حکم دیا کہ طلیحہ کی فوج کے جتنے سپاہی گرفتار ہوں انھیں آگ میں جلا کر ہلاک کر دیا جائے۔ سپہ سالار نے گڑھے کھدوائے۔ ان کی فوج کے صحابہ نے دریافت کیا کہ ان کا کیا ہوگا تو جواب ملا۔ قیدیوں کو آگ میں جلاؤں گا۔ صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو خالد بن ولیدؓ نے کہا کہ مجھے ابوبکرؓ نے لکھا کہ اگر خدا انھیں فتح عطا کرے تو تم قیدیوں کو آگ میں جلا دینا۔ (۵) اسی طرح جنگ یمامہ کے موقع پر مسیلمہ کذاب کے قبیلہ بنو حنیفہ کے بارے میں خالد بن ولید کو آپ نے لکھا "اگر خدا تمھیں

فتح عطا کرے تو ان کے ساتھ نرمی سے پیش نہ آنا ان کے زخمیوں کا کام تمام کر دینا ان میں سے جو بھاگ جائیں ان کا تعاقب کرنا اور جو ہاتھ آ جائیں ان کو قتل کر دینا اور آگ میں جلا دینا۔ (۶)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالعموم آگ کی سزا دینے سے منع فرمایا ہے مگر ابوبکرؓ نے مرتدین اور غالی مشرکین کے لئے یہ سزا اس لئے تجویز کی کہ ان کے نزدیک اسلام کے بعد کفر کا راستہ اختیار کرنا اور اسلام کی جڑ کاٹنے پر کمر باندھنا ایسا جرم ہے جس کی سزا اس سے کمتر ہو ہی نہیں سکتی۔ قبیلہ سلیم کے ایک بڑے راہزن عرب مجاءۃ کے لئے بھی آپ نے یہی سزا تجویز کی تھی۔

ان واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ نرمی سختی کے مقابلے میں پسندیدہ چیز ہے لیکن جب معاملہ حق و باطل کا آ جائے تو ایسے میں نرمی اختیار کرنا گویا مداہنت برتنا ہے، اس لئے حق کے معاملہ میں نرم اور کفر کے معاملہ میں سخت یعنی اشداء علی الکفار رحماء بینھم کا حال مناسب ہے۔

حواشی

(۱) منتخب التواریخ اول باب جلال الدین خلجی بدایونی
(۲) تفسیر ابن کثیر اول صفحہ ۳۳۴
(۳) اتمام الوفا فی سیرۃ الخلفاء صفحہ ۹ خضری بک
(۴) ایضاً صفحہ ۲۴ (۵) تاریخ ندوہ صفحہ ۵۵ (۶) ایضاً صفحہ ۶۰

(بقیہ حضرت خنساءؓ)

ایک عظیم مثال ہیں کہ اتنی پیرانہ سالی میں چار بیٹوں کو قربان کرنے کے بعد بھی یہ حسرت رہی کہ کچھ اور ہوتے تو اللہ کی راہ میں قربان کر دیتی۔

جنگ قادسیہ کے تقریباً دس سال بعد ۲۴ھ میں انتقال ہوا کچھ روایتوں کے مطابق آپ اموی دور تک زندہ رہیں۔

"خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را"

غزل

عزیز گھروی
۲۵۰۳ بارہ دری شیر افگن
بلیماران، دہلی ۱۱۰۰۰۶

جلنے کو تو جل جاتا ہے
کب رسی کا بل جاتا ہے

رہ جاتے ہیں ہیرے موتی
کھوٹا سکہ چل جاتا ہے

قدرت کا قانون اٹل ہے
سورج چڑھ کر ڈھل جاتا ہے

خوشیاں ماتم بن جاتی ہیں
غم خوشیوں میں ڈھل جاتا ہے

سب کی آگ بجھانے والا
اپنی آگ میں جل جاتا ہے

زخموں کے بھرنے سے پہلے
تیر ستم پھر چل جاتا ہے

آ کر پہریدار نہ جائیں
ہر خطرہ تو ٹل جاتا ہے

کیسا ہے کردار ہمارا
ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے

منظر بے ترتیب چمن کا
ذوقِ نظر پر کھل جاتا ہے

وقت بدلتا ہے جب کروٹ
سب کا طور بدل جاتا ہے

دانشمند عزیزؔ وہی ہے
جو ہر وقت سنبھل جاتا ہے

سید نورالدین قادری نورؔ
پرنسپل اسلامیہ کالج، منصورہ، آلور
ہاسن۔ کرناٹکا

غزل

اٹھایا ہم نے جب سر تیرے در سے
ہوئی ہے زندگی بدتر سفر سے

خضر سا راہبر ملتا کہاں ہے
نظر آئے بہت چہرے خضر سے

ہزاروں کوہ سے گر کر اٹھے ہیں
نہیں اٹھا کوئی گر کر نظر سے

نوازش ان پہ دنیائے حسیں کی
نوازا ہی گیا درد جگر سے

بچھے جاتے ہیں بزم یار میں وہ
جو ہر محفل میں لگتے تھے نڈر سے

ہوا معلوم بعدِ موت اتنا
پلٹ آئے ہیں ہم جیسے سفر سے

ق
کیا ہے اکتسابِ فیض جس نے
خدا کے آخری پیغام بر سے
اسی کے دن ہیں، راتیں ہیں اسی کی
مبرا نور ہے وہ ہر خطر سے

کشاکش

زندگی کو جیسے سورج نکلا
اس پہ فرد جرم عائد کی گئی
اور اندھیرے
سب کے سب
پھر مل گئے

عارف اعظمی

اسلامی ادب میں عقیدہ کا تصوّر

کسی زبان کے شعراء و مصنفین کا وہ نادر کلام جس میں نازک خیالات وجذبات کی عکاسی اور باریک معانی ومطالب کی ترجمانی کی گئی ہو اس زبان کا ادب کہلاتا ہے (۱)۔

کسی دور کا ادب محض فنی محاسن اور صنائع وبدائع کی بنا پر مقبول نہیں ہوتا بلکہ اس کی عوامی مقبولیت میں ہم عصر روایات اور عقائد کی آمیزش کا بھی دخل ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی عظیم شاعر یا ادیب عقیدے سے مبرا نہیں ہوسکتا خواہ اس کا عقیدہ حق ہو یا باطل۔ کیونکہ بقول علامہ شبلیؒ "کلام کی خوبی صرف محاکات کا نام نہیں، کلام کی غرض وغایت صرف سامعین کو محظوظ کرنا نہیں بلکہ عقل کی سفارت اور پیغامبری ہے"(۲)۔

اسلامی ادب کو رجعت پسند اور جمہوریت و وطن پرستی کا مخالف سمجھا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کو چودہ سو سال پیچھے کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ ادب کی جنس لطیف (شاعری) میں اسلامی عقیدہ و فلسفہ کو ٹھونس کر شعریت کا خون کرتا ہے عہد حاضر کے پیچیدہ مسائل سے آنکھیں بند کرکے صرف اسلام کی ترجمانی کرتا ہے۔ حالانکہ ادبی پیرائے میں اپنے عقیدہ کی دعوت وتبلیغ اور نشر واشاعت صرف اسلام ہی کا خاصہ نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام قوموں نے اپنے ادب میں اپنے مزعوم عقیدے کی تعبیر کی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مطلق ادب کی تخلیق ہی عقیدے کی گود میں ہوئی ہے۔ تاریخ ادب کا عظیم محقق "ول ڈیورنٹ" لکھتا ہے: "سب سے قدیم انسانی قصائد جو وجود میں آئے وہ نہ تو رجزیہ

۱۔ مقدمہ تاریخ الادب العربی مولفہ احمد حسن زیات۔ ترجمہ وتلخیص محمد طفیل مدنی

۲۔ مقالات شبلی جلد دوم ص ۲۴

کلام تھے اور نہ غزلیہ گیت بلکہ دعائیں اور التجائیں تھیں"(۳)۔

علامہ شبلی لکھتے ہیں: "حضرت داؤدؑ پر جب خدا کے احسانات کا اثر غالب آتا تھا تو بے ساختہ وجد میں آکر رقص کرنے لگتے تھے۔ ان کا کلام جس قدر ہے سرتاپا شعر ہے جو ان کے پرجوش دل سے بے ساختہ نکلتا تھا"(۴)۔

چنانچہ اسلام سے پہلے کے ہندوستانی بت پرست رہے ہوں یا فرعونی عہد کے مصری ادباء وشعراء سب کے کلام میں ان کے عقیدے کی ترجمانی پائی جاتی ہے۔

ہندوؤں کی مقدس منظوم کتاب "رگ وید" سے استناد کرتے ہوئے "ہیوکیڈی" نے اپنی کتاب "لینڈ آف فائیو ریورز" میں لکھا ہے۔

"رگ وید کی رو سے اس دور کے آریاؤں کا مذہب سیدھا سادہ توہم پر مبنی تھا، وہ کائنات پر محیط اور اتھاہ اندر طاقتوں مثلاً سورج، آسمان، صبح کی روشنی اور بادلوں میں چمکنے والی روشنی کو معبود قرار دے کر ان کی پرستش کرتے تھے"(۱)۔

رگ وید میں ایک ہزار قدیم منتر ہیں جن میں صرف اندر دیوتا اور اگنی دیوی کی تعریف ہی کوئی پانچ سو منتروں میں کی گئی ہے(۲)۔

محض یہی نہیں رگ وید سے آریاؤں کے معبودوں کی اشکال کا پتہ بھی ملتا ہے۔ رگ وید میں جنت دوزخ کا تصور بھی موجود ہے۔ آریاؤں کا یہ خیال تھا کہ اگر وہ دیویوں اور دیوتاؤں کے حضور قربانیاں نذر کریں گے تو وہ ان پر مہربان ہوجائیں گے رگ وید میں ان قربانیوں کی پوری تفصیل موجود ہے۔

فرعونی عہد کے مصری ادب میں بھی اہرام کی عمارتوں پر کندہ نقوش وآثار قبروں کے

---

(۱) لینڈ آف فائیو ریورز ص ۲۴ بحوالہ مطالعہ تاریخ مولفہ کوثر نیازی

(۲) کلچرل ہیریٹیج آف انڈیا ص ۲۴

(۳) قصۃ الحضارۃ مولفہ ول ڈیورنٹ، عربی ترجمہ از ڈاکٹر زکی نجیب محمود

(۴) مقالات شبلی جلد دوم ص ۳۹

مکتوبات اور آموں کے ترانے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اور یہ تمام ادبی آثار عقیدہ کے تصور سے لبریز ہیں۔ خاص طور پر مصری معبود اتون جسکا علامتی نشان سورج تھا کی حمد میں کہے گئے ترانے جنکو اخناتون نے نظم کیا ہے، مصری عقائد کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں۔ اخناتون اپنے معبود اتون کی حمد میں کہتا ہے۔

"اے معبود (اتون) جب آپ آرام فرما ہوتے ہیں تو پوری زمین میں گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیل جاتا ہے، گویا وہ مردہ ہے، لوگ اپنے گھروں میں سو جاتے ہیں، کوئی شخص دوسرے کو نہیں دیکھتا۔ اس وقت شیر اپنے مسکن سے اور سانپ اپنے بلوں سے باہر نکلتے ہیں اور حملہ آور ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ لیکن جب آپ کا اشارہ ہوتا ہے، زمین سیاہی کی قبا چاک کر دیتی ہے اور لوگ جاگ جاتے ہیں اور چلنے پھرنے لگتے ہیں، پھر ہاتھ منہ دھل کر تیری عبادت میں مشغول ہوتے ہیں، اور پوری زمین میں کام کاج پھیل جاتا ہے۔

آپ نے کتنی چیزیں پیدا کی ہیں، آپ نے اپنی قوت و ارادہ سے زمین، انسان حیوان اور ہر چھوٹی مخلوق پیدا کی، آپ ہی نے وہ تمام مخلوق بھی پیدا کی جو دو پیروں پر چلتی ہے یا فضا میں پرواز کرتی ہے، آپ ہی نے سرزمین شام، حبش کے شہر اور ارض مصر پیدا کی،، (۱)

اسی طرح اخناتون کا یہ مکمل ترانہ مصری وثنی عقیدے پر مبنی ہے۔

اسلام سے قبل یونان و روم دونوں متمدن قوموں کے قدیم ادب میں بھی دعائیں، حمدیہ نظمیں، معبودوں کی حمد وثناء اور پرانے بزرگوں کے واقعات و قصص اور ان کی تعلیمات خاص ادبی موضوعات تھے۔ ڈاکٹر محمد غنیمی ہلال لکھتے ہیں: ,, ان کے ادبی قصوں میں نہایت سادہ طور پر قدماء کے عقائد کا ذکر ہوتا تھا، ادبی روایتوں میں مرکزی حیثیت وطن پرست یا دینی عقائد کے حاملین کو حاصل ہوتی تھی ،، (۲)

---

(۱) مصر فی العصور القدیمة، مؤلفہ ابراہیم سیف الدین اور ان کے رفقاء، ص ۳۸

(۲) الادب المقارن، مؤلفہ ڈاکٹر محمد غنیمی ہلال، ص ۴۳

حضرت عیسیٰ کی ولادت سے آٹھ صدی قبل مشہور یونانی شاعر "ھومر" گذرا ہے جسکی دو مشہور و معروف طویل رزمیہ نظمیں "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" ہیں دونوں نظمیں مشرکانہ یونانی عقائد سے پُر ہیں، اسی طرح روم کے معروف بت پرست شاعر "ورجل" کی شہرہ آفاق رزمیہ نظم "اینیاڈ" دیومالائی قصوں اور وثنی عقائد سے مرصع ہے۔

یونان کے صوبہ "تھسلی" میں ایک پہاڑ ہے جسکی سب سے اونچی چوٹی پر جو نہایت وسیع و فراخ ہے ہر وقت بادلوں کا ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہتا ہے "ھومر" اور اس کے بعد کے یونانی شعراء کا یہ عقیدہ تھا کہ اس چوٹی پر مہا دیوتا "زیوس" جسکا دوسرا نام "جوپیٹر" تھا دوسرے چھوٹے بڑے دیوتاؤں کے ساتھ رہتا ہے، اور وہاں سے یہ سب جب چاہتے ہیں بادلوں میں لپٹے ہوئے آسمان کو چلے جاتے ہیں (۲)

یہ سارے عقیدے ھومر اور اس کے ہم عصر اور بعد کے زمانہ کے شعراء نے نظم کئے ہیں۔

رومی ادب میں بھی ورجل کی رزمیہ نظم اینیاڈ کے علاوہ بزم کی آراستگی میں قصیدہ "سالو رنی" عقائد کی تعبیر کے لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس قصیدہ میں رومی معبود "مارس" کو مخاطب کرکے دعا کی گئی ہے۔

اس قصیدہ کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"اے مارس لوگوں سے تباہیوں اور بربادیوں کے سیلاب کو ہٹا دے، اے ظالم مارس بس کر، اپنا ظلم ختم کر، دوسرے معبودوں کو بھی ان کے فرائض انجام دینے کی مہلت دے۔ ۔ ۔ اے مارس ہماری مدد کر (۱)

اسلام سے قبل ادب کے عالمی لٹریچر میں عقائد کی تعبیر و تشریح کا یہ اجمالی خاکہ تھا، اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ادب میں عقیدہ کی تعبیر و تشریح اسلام کی ایجاد نہیں بلکہ عین

---

(۱) تاریخ الادب الرومانی مؤلفہ ج۔ و۔ دف، عربی ترجمہ از محمد سلیم سالم

(۲) حاشیہ بر کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" ص ۔ از ظفر علی خان

انسانی فطرت ہے۔

محض یہی نہیں اسلام کے نمودار ہونے کے صدیوں بعد ملٹن، دانتے اور ورڈسورتھ نامور شعرا گذرے ہیں جنکی شاعری خالص ان کے مذہبی عقائد کی ترجمان تھی۔

ملٹن نے پیوریٹن تحریک کی حمایت اور مسیحیت کی تبلیغ واشاعت کے لئے اپنی رزمیہ نظم "فردوس گم گشتہ" لکھی جو خالص مسیحی نقطۂ نظر سے آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کی داستان پر مبنی ہے، اسکی دوسری نظم "فردوس بازیافتہ" ہے جس میں عیسائیوں کے مشہور عقیدے "کفارہ" کی وضاحت وتشریح کی گئی ہے، اور تیسری نظم "سیمسن" ہے جسکا مرکزی مضمون بھی مسیحی عقیدے کی ترجمانی کرتا ہے۔

اسی طرح "دانتے" نے اپنی رزمیہ نظم "ڈیوائن کیمڈی" لکھی پوری نظم عقیدۂ تثلیث پر قائم ہے۔ حتی کہ تثلیثی نقطۂ نظر سے بند وقوافی تک مثلث استعمال کئے گئے ہیں۔

عصر حاضر میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور سائنس وٹیکنالوجی کی غیر معمولی ترقی کے بعد مختلف عقائد ونظریات کا جو سیلاب امنڈ پڑا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہر مکتب فکر کا ادیب شاعر اپنے عقیدۂ وفکر کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم ہے۔

کسقدر ناانصافی کی بات ہے کہ ملٹن، دانتے، ورڈس ورتھ اور اسی طرح کے دوسرے تمام مختلف الخیالات ونظریات شعراء وادباء کا کلام تو عالمی شہ پارہ تصور کیا جائے اور اقبال وحالی کی شاعری اور ان کا کلام جو اسلامی فکر وعقیدہ کے ساتھ تمام فنی محاسن اور صنائع وبدائع سے مالا مال ہے رجعت پسندانہ تعصب پر مبنی قرار دیا جائے

تاریخ شاہد ہے کہ اعلیٰ ادب کے ظہور میں ہمیشہ سے فکر وعقیدہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ خواہ وہ ادب ورجل کا ہو یا دانتے کا، ورڈسورتھ کا ہو یا اقبال کا۔

دنیا کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر جبکہ کہیں سرمایہ داری کے ترانے گائے جارہے ہیں اور کہیں انسانی مساوات کی آڑ میں الحاد کے راگ الاپے جارہے ہیں اور کہیں قومیت ووطن پرستی کی دھنیں بج رہی ہیں، اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے زبان و ادب جیسے خداداد وسیلہ کا استعمال مسلمانوں پر فرض ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ

(بقیہ ص ۴۹ پر)

غزل

ادریس ضیار

وقت کی تمازت میں بس وہی پگھلتے ہیں
موم کا بدن لے کر گھر سے جو نکلتے ہیں

جلنے والے بڑھ بڑھ کر جن کو خوب جلتے ہیں
ایسا نام چہرے پر لکھ کے ہم نکلتے ہیں

آپ اپنی نفرتوں کو تجربوں کا رخ دیجے
لوگ اپنے چہرے تو روز ہی بدلتے ہیں

آندھیوں سے کہہ دیجے: سرپھروں کی بستی میں
اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں

وقت ایک دن ان سے انتقام لیتا ہے
وقت کے تقاضے جو پاؤں سے کچلتے ہیں

اب خلوص کو مجھ جیسا دوسرا نہیں ملتا
مجھ سے دشمنی کرکے غم بھی ہاتھ ملتے ہیں

اے ضیار سنبھل کے رکھ یہ وفا کے آئینے
پتھروں کے سینوں میں انتقام پلتے ہیں

الحاد سے اسلام تک

سید عظیم شاہ بخاری

بہت دنوں کی بات ہے۔ ان دنوں میں پشاور شہر کے اس اسکول میں پڑھتا تھا جسے آج کل گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر ۱ کہا جاتا ہے۔ ان دنوں شہر اور صدر میں صرف یہی ایک سرکاری اسکول تھا۔ ایک اسکول مسلمانوں کا تھا، اسلامیہ ہائی اسکول، اور باقی چار پانچ اسکول عیسائیوں کے تھے۔ کبھی علامہ عنایت اللہ خان المشرقی بھی انگریزی حکومت کے عتاب میں آکر ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ فرنگی انھیں ملازمت سے نکال تو نہیں سکے تھے، اس لیے اس ہندستانی آئی سی ایس کو اعلیٰ اور ذمے دار عہدوں سے ہٹا کر ایک ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا تھا۔

علامہ نے ہیڈ ماسٹر بننے کے بعد اپنے اسلامی جذبے اور قومی خدمت سے ہاتھ نہیں اٹھا لیا تھا۔ انھوں نے پہلے تو اس واحد سرکاری اسکول کو ایک اعلیٰ درجے کی عمارت دی، پھر اسے ہر قسم کے جدید سامان سے لیس کیا یہاں تک کہ وائرلیس کا ایک طاقتور سیٹ بھی سائنسی تجربہ گاہ میں لا رکھوایا۔ چنانچہ ایک دن قلعہ بالا حصار کے گورے اسکول کے اوپر لگا ایریل اکھیڑنے آگئے کیونکہ ان کے خیال میں ان کی پیغام رسانی میں رکاوٹ ڈالتا تھا۔ مگر علامہ نے انھیں اسکول سے نکلوا دیا۔ کچھ دن جھگڑا چلتا رہا۔ آخر کار اس وائرلیس سیٹ کو ہائی اسکول کے سائنسی آلات کا ایک حصہ قرار دے کر بخش دیا گیا۔

علامہ نے غالباً سب سے پہلے گورنمنٹ اسکولوں میں بچوں کو ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم دینے کی ضرورت محسوس کی اور پہل کارپنٹری یعنی بڑھئی کی ایک کلاس سے کی جس میں بچوں کو ابتدائی آلات کے استعمال اور مروجہ فرنیچر بنانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ فیس کوئی نہ تھی کلاس مفت تھی۔ مجھے ٹھیک سے یاد تو نہیں مگر میرا خیال ہے کہ اس کلاس میں داخلہ لینے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے چار پانچ روپے وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔

دوسرا اہم کام جس کا آغاز علامہ نے کیا، اچھے پیمانے پر دینیات کی تعلیم تھا۔ ہمارے اسکول

میں انگریزی اور حساب کی طرح دینیات کو بھی پوری اہمیت دی جاتی تھی۔ ان دنوں اور سرکاری اسکولوں میں دینیات کی پڑھائی کا انتظام ابھی دور کی بات تھی۔ ہمارے یہاں نویں اور دسویں جماعت کے اس طالب علم کو ایک خاص وظیفہ بھی دیا جاتا تھا جو دینیات میں اول آتا تھا۔ یہ وظیفہ آٹھ روپے ماہوار تھا۔ ان دنوں یہ آٹھ روپے بھی بہت بڑی رقم تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگ سکتا ہے کہ ایک طالب علم کا بورڈنگ ہاؤس کا خرچ کم و بیش چار روپے ماہوار آتا تھا۔

مجھے فخر ہے اور اللہ کا بڑا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایک علم دوست خاندان میں پیدا کیا۔ میرے والد اور نانا دونوں بہت بڑے عالم تھے۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت بھی انھیں کے سائے میں ہوئی۔ اسکول میں جو مسائل کی مختصر کتاب اور قرآن مجید کا پہلا پارہ مع ترجمہ و مختصر تفسیر کلاس میں پڑھائے جاتے تھے میں اس سے بہت زیادہ گھر میں پڑھ چکا تھا اور شاید اسی لیے میں بعض دوسرے پیریڈوں کے علاوہ اکثر دینیات کے پیریڈ سے بھی غیر حاضر رہتا تھا۔ یہ فخریہ نہیں کہہ رہا بلکہ اسکولوں میں ایسا ہوتا ہے۔

اور اگر میں کلاس میں چلا بھی جاتا تو مولوی صاحب سے ایسے مسائل پوچھتا رہتا یا تفسیری نکتوں کی وضاحت چاہتا جو ہمارے کورس میں شامل ہی نہ تھے۔ مولوی صاحب اللہ انھیں بہشت بریں میں جگہ عطا فرمائے بہت ہی قابل شخص تھے اور قدر دان بھی۔ وہ میرے سوالوں کا جواب بڑی خندہ پیشانی اور تفصیل سے دیا کرتے اور اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ میری کتنی حوصلہ افزائی اور کتنی قدر کرتے تھے۔ جب دینیات کا خاص وظیفہ ملنے کا وقت آیا تو انھوں نے کمال مہربانی سے وہ مجھے عطا کر دیا۔

ہماری کلاس میں ایک اور ذہین طالب علم تھا۔ دوسری کلاسوں کی طرح دینیات کی کلاس میں بھی بڑا حاضر باش۔ نماز روزے اور دینی قدروں کا بڑا پابند۔ ان دنوں اس نے داڑھی بھی چھوڑ رکھی تھی۔ اسکول کے احاطے میں مسجد تو ابھی نہیں بنی تھی مگر ایک خاص چبوترہ نماز کے لیے مخصوص تھا۔ وضو کی سہولت بھی وہیں میسر تھی۔ پیشین یعنی ظہر کی نماز سب نمازی استاد اور طالب علم اس چبوترے پر پڑھا کرتے۔ یہ طالب علم جسے میں ایک فرضی نام زبیر سے یاد کروں گا خاص طور پر پیشین کی نماز بڑی باقاعدگی سے پڑھا کرتا تھا۔ وہ سب سے پہلے چبوترے پر آتا۔

میرزی کی بھی چٹائی کھول کر بچھا دیتا، اپنی چادر سے گرد جھاڑتا۔ اور سب جھگڑے یکدم ذہن میں اکٹھے کر دیا کرتا۔

ان تمام باتوں کی وجہ سے وہ خود کو اس خاص وظیفے کا حقدار سمجھتا تھا، اس لئے اس نے مولوی صاحب کے اس فیصلے کے خلاف ہیڈ ماسٹر کی خدمت میں اپیل دائر کر دی۔ اعتراض یہ تھا کہ مولوی صاحب نے یہ وظیفہ جو میرا حق تھا ایک ایسے طالب علم کو دے دیا ہے جو اور تو اور دینیات کے پیریڈوں سے بھی اکثر غیر حاضر رہتا ہے۔ مولوی صاحب کی پیشی ہوئی تو انھوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں جس طالب علم کو وظیفے کا حقدار سمجھتا تھا اسے دے دیا ہے۔ میں نے صرف نمازیں پڑھنے یا مسجد میں جھاڑو وغیرہ دینے کی بنا پر نہیں دیا بلکہ قرآن اور دینی مسائل میں سب سے قابل طالب علم کو دیا ہے۔ یہی نہیں مولوی صاحب ہیڈ ماسٹر صاحب سے بہت بگڑے اور فرمایا کہ آپ نے میری دیانتداری پر شبہ کیا ہے۔ بہرکیف مولوی صاحب کا فیصلہ نہ بدلا اور زید اپنی ظاہری ہیئت گردی کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہا۔

اس بات کو ایک سال سے بھی کم عرصہ گزرا ہوگا کہ زید کا تعلق کچھ لادین اور دہریہ قسم کے لوگوں سے ہو گیا، معلوم نہیں عیسائی مبلغ تھے، آریہ سماجی تھے یا اور کوئی دہریہ خیال کے لوگ۔ زید نے ان کا اثر بڑی جلدی سے قبول کیا اور انھوں نے اس کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ وہ بھی انھیں کی طرح پکا لادین اور دہریہ ہو گیا۔ وہ ان لوگوں سے سائنس وغیرہ کی یا دوسری خلاف اسلام باتیں سنکر اور سیکھ کر آتا اور اسکول کے دوسرے لڑکوں سے بیان کرتا۔ ان سے بحثیں کرتا اور اس طرح کچے ذہنوں میں خواہ مخواہ شکوک پیدا کرنے لگا۔ پہلے تو وہ یہ باتیں چوری چھپے، اکا دکا طالب علم کے سامنے کرتا تھا مگر بعد میں علانیہ یہ کام کرنے لگا۔ وہ برملا کہتا میں ثابت کر سکتا ہوں کہ اسلام نعوذ باللہ ایک جھوٹا مذہب اور قرآن کوئی اسلامی کتاب نہیں۔

ہر چند ایک طالب علم اس کی ان باتوں کا اپنے علم اور بساط کے مطابق جواب دیتے مگر ان خرانٹ ملحدوں اور عیسائی مبلغوں کے پیدا کئے ہوئے مسائل کا جواب تو بڑے عالم ہی دے سکتے تھے۔ ان دنوں وہ مولوی صاحب جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ملازمت چھوڑ کر جا چکے تھے اور ان کی جگہ پر مولوی صاحب آئے تھے وہ اس میں اس سے دلچسپی نہیں لیتے تھے کہ کہیں ہیڈ ماسٹر صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔ آخر کار ہم نے ایک پارٹی بنائی اور بات ہیڈ

ماسٹر صاحب کے گوش گزار کی کہ دہریوں اور عیسائی مبلغین کے پھیلائے ہوئے فساد کا سدباب کیا جائے۔ مگر وہ بھی اوپر کے ڈر سے کوئی خاص عملی قدم نہ اٹھا سکے۔ اور دہریت والحاد کا پروپیگنڈہ ختم نہ کیا جا سکا۔ پھر ہم نے سیاسی حربہ استعمال کیا اور بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والوں سے بھوک ہڑتال کروا دی اور الٹی میٹم دے دیا کہ اگر اب بھی اسکول سے یہ فساد ختم نہ کرایا گیا تو ہم کلاسوں کا بائیکاٹ کریں گے۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے زید کے والدین کو اطلاع دی اور خود بھی اسے دھمکی دی کہ اگر تم اپنی ان حرکات سے باز نہ آئے تو اسکول سے نکال دیا جائے گا۔ کچھ ہیڈ ماسٹر کی دھمکی اور کچھ اعزہ و اقربا کے سمجھانے بجھانے سے زید کچھ راہ راست پر آ گیا اور کم از کم اسکول میں ان بے دینوں اور دہریوں کا دیا ہوا زہر پھیلانا اس نے بند کر دیا۔ باہر اگر کچھ کام کرتا تھا تو اس سے ہم اسے روک نہیں سکتے تھے۔

اب اسکول کے اندر نماز اور اذان وغیرہ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس نے اپنی بچی کچی داڑھی بھی منڈا کر صفاچٹ کرا دی تھی۔

دسویں کے امتحانات تک اسکول کے دن امن و سکون سے گزرے اور پھر امتحان سے فارغ ہونے کے بعد ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے اور ہم اللہ کی زمین میں پھیل گئے میٹرک میں کامیاب ہونے کے بعد زید نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس کا علم بھی مجھے اس طرح ہوا کہ ایک دن وہ میرے گاؤں آ نکلا۔ وہ کالج کی وردی میں تھا۔ سفید شلوار، کالی شیروانی اور سر پر طلا دار کلاہ اور اس پر پشاوری لنگی۔ بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ گھر پر آئے دشمن سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لہذا میں نے اسے خوش آمدید کی۔ اس نے کچھ وقت میرے ساتھ گزارا اور جاتے وقت مجھ سے کچھ کتابیں مانگیں، انگریزی کی ڈکشنری اس کے کام آ سکتی تھی وہ میں نے اسے دیدی۔ اس کے بعد وہ مجھے نہیں ملا۔ کالج کی آزاد فضا میں خدا ہی جانتا ہے کیا کیا کچھ گل کھلائے ہوں گے مگر مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہاں کے اساتذہ اور طالب علموں میں بہت سے ایسے نکل آئیں گے جو اس کا منہ بند کر سکیں گے۔

بعد میں وہ لکھنؤ چلا گیا، کچھ عرصہ وہاں آرٹ سیکھتا رہا اور جب واپس اپنے گاؤں آیا تو بھی اس سے ملنے کا کہیں اتفاق نہیں ہوا۔ ایک سابق ہم جماعت سے پتہ چلا کہ اس نے کالج

پہلے ہی سال چھوڑ دیا تھا، بدگمانی جائز نہیں مگر ایسا لگتا تھا کہ اسے وہاں بہت سخت مزاحمت بلکہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ یا پھر مالی مشکلات درپیش ہوں گی،

دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ وقت کے ساتھ پرانی یادیں بھی محو ہونے لگیں اور دوسرے بہت سارے ساتھیوں کی طرح زید کا نام بھی ذہن سے نکل گیا۔

پشاور شہر میں ہمارے گاؤں کا اڈا ان دنوں ہشتنگری گیٹ کے باہر تھا۔ گیٹ کے باہر ہی ہمارے گاؤں جانے والے تانگے کھڑے ہوتے تھے، ان دنوں لاریاں اور بسیں بہت کم تھیں۔ اور چھوٹے راستوں پر تو ان کا نظر آنا ہی محال تھا۔ گرمی کے دن تھے میں گاؤں جانے کے لئے کابلی دروازے سے ہشتنگری گیٹ آنے والے تانگے سے اترا۔ اڈا خالی تھا۔ کوئی تانگہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا چلو سامنے کے ہوٹل میں چائے ہی پی لی جائے، اس طرح کچھ وقت بھی گزر جائے گا اور اتنے میں گاؤں جانے والا کوئی تانگہ بھی آ سکے گا۔ میں نے ہوٹل کی جانب دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ سامنے سے پولیس کا ایک سپاہی تیزی سے آتا دکھائی دیا۔ میں اسے راستہ دینے کے لئے ایک طرف ہونے ہی والا تھا کہ والہانہ طور پر آگے بڑھ کر وہ شاہ جی، شاہ جی کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔

میں حیران تھا کہ پولیس کا کون سپاہی ایسا جگری دوست ہو سکتا ہے جو یوں والہانہ طور پر گلے سے لپٹ گیا۔ میں نے بھی جواباً اور وضع داری اپنے ہاتھ بڑھا کر اسے گلے سے لگا لیا۔ جب معانقہ و مصافحہ ختم ہوا اور ہم آمنے سامنے کھڑے ہوئے تو بھی میں اسے پہچان نہ سکا۔ وہ بھی میری پریشانی بھانپ گیا اور فوراً کہہ اٹھا کہ ارے آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میں زید ہوں زید۔ زید کا نام سن کر میں چونکا کیونکہ اس سپاہی کی لانبی لانبی گھنی داڑھی سے اوپر گھنی بھنووں کے نیچے اس کی شوخ اور باہر کو ابھری ہوئی آنکھوں نے مسکرا مسکرا کر مجھے اسکول کے دنوں کا زید یاد دلا دیا تھا۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا: ارے تو زید! تجھے مجھ سے گلے ملنے کا کیا حق تھا، مرتد، ملحد، دہریئے۔

شاہ جی گالیاں مت دو، وہ کہنے لگا۔ میں اب مرتد اور ملحد نہیں ایک پکا مسلمان ہوں؟

"کیا، کیا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"دیکھو، اس نے اپنی گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

کوئی نیا ڈھونگ رچایا ہے کیا،" میں نے کہا۔

"نہیں شاہ جی سچ مچ مسلمان ہو گیا ہوں۔ مان لو، میں واقعی مسلمان ہو گیا ہوں، پکا مسلمان،" اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔

"پر مجھے یقین نہیں آ رہا،" میں نے کہا۔

آپ کو یقین آنا بھی نہیں چاہئے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے، میں ابھی آپ کو سارا حال بتاتا ہوں۔ پھر اس نے پوچھا، آپ چائے پینے چلے تھے؟"

ہاں، میں نے کہا: چلو تم بھی ایک پیالی پی لو اور مجھے بتاؤ کہ یہ بات کیا ہے۔"

"نہیں آپ چائے میرے ساتھ پئیں گے سامنے تھانے میں، اس نے کہا، میں اسی تھانے میں محرر ہوں۔

میں نے اس کے شانے کی طرف دیکھا، وہاں تین پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔

میں حرام کے پیسوں کی چائے نہیں پیتا اور وہ بھی ایک دشمن دین اور ملحد کی۔ میرے لہجے میں طنز تھا۔

"میں آپ کو بالکل حلال کے پیسوں کی چائے پلاؤں گا، اس نے کہا۔ پکے مسلمان کی چائے۔" تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں، کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ جو تمہیں سلام کہے اس کے متعلق یہ مت کہو کہ وہ مومن نہیں۔

آیئے میں اپنی ساری سرگزشت سناتا ہوں، پھر آپ کو یقین آ جائے گا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

اور پھر ہم تھانے کی طرف چل دیئے، جو ہشتنگری گیٹ کے ساتھ ہی واقع ہے۔ وہاں اس کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے، اس نے پولیس کے ایک سپاہی سے چائے لانے کو کہا اور پھر اطمینان سے اپنی طویل کہانی سنانے لگا۔

معلوم ہوا کالج سے نکلنے یا نکالے جانے کے بعد وہ کچھ عرصہ اسی کفر و الحاد میں مبتلا رہا، پھر ایک دن اچانک اسے اپنے دوست سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ایک کتاب مل گئی۔ اس کتاب کے مطالعے نے اس کے دل میں مولانا کی دوسری کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کر دیا۔ اس طرح ایک ایک کرکے اس نے مولانا مرحوم کی وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو اس

وقت چھپ چکی تھیں جیسے تفہیمات، تنقیحات وغیرہ۔ ان کتابوں کے مطالعے نے اس کی فکر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ پھر اس نے خود مولانا سے خط کتابت شروع کی۔ اپنے شکوک وغیرہ بیان کئے اور مولانا مرحوم کی طرف سے اسے بڑے عالمانہ، تفصیلی اور تسلی بخش جواب ملے تا آنکہ وہ کفر و الحاد کی تاریکیوں سے دھیرے دھیرے نکل کر اسلام کی براق روشنی کی طرف لوٹ آیا، اپنی ملحدانہ زندگی پر شرمسار اور اللہ کے حضور تائب ہوا اور پھر سے ایک سچے مسلمان کی سی زندگی شروع کی۔ اس نے اپنی ملازمت کے متعلق مولانا سے دریافت کیا تو انھوں نے اسے چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے دن تھے۔ فوج اور پولیس کے استعفے منظور نہیں کئے جاتے تھے، مگر اللہ نے مدد کی زید کا استعفا کسی طور منظور ہو گیا اور وہ چند ہی دنوں میں پولیس کی اس ملازمت سے سبکدوش ہونے والا تھا۔

یہ تو تھا خلاصہ اس کہانی کا جو اس نے بیان کی۔ پولیس کی ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ جماعت اسلامی کا ایک سرگرم کارکن بن گیا اور بعد میں اسے جماعت کا رکن بنا لیا گیا۔ رکن کی حیثیت سے اس نے بہت گرانقدر خدمات انجام دیں۔ جماعت کا کام پھیلایا اور بہت سے لوگوں کو جماعت کا ہمدرد بلکہ رکن تک بنایا۔ بہت عرصہ کام کرنے کے بعد اس سے ایک غلطی سرزد ہوئی۔ اگرچہ اس کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتی تھی، مگر اس کی وجہ سے وہ جماعت میں اس اعلیٰ مقام کا اہل نہ رہا اور اس کی رکنیت ختم کر دی گئی۔ اس کی جگہ ان لوگوں نے لے لی جنھیں وہ جماعت میں لایا تھا۔

زید ان دنوں پرائیویٹ طور پر پڑھنے پڑھانے کی چھوٹی موٹی ملازمت کر لیتا ہے تھوڑی بہت زمین بھی ہے جس سے گزر بسر ہوتی ہے۔ وہ اب بھی اپنے طور پر جماعت کے لئے کام کرتا رہتا ہے۔ جہاں کہیں بھی ملتا ہے دو ایک کتابیں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ضرور اس کے پاس ہوتی ہیں۔

حیات نو اگر آپ کو پسند ہے تو دوسروں تک پہونچائیں

ترجمانی ابوجاوید

حضرت عتبہ ابن غزوان رضی اللہ عنہ

تحریر۔ الدکتور عبدالرحمان رافت الباشا

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نماز عشاء سے فارغ ہو کر اپنی خوابگاہ میں تشریف لائے۔ وہ تھوڑی دیر آرام کر لینا چاہتے تھے تاکہ رات کو گشت کرنے کے لئے تازہ دم ہو جائیں۔ لیکن نیند اس وقت خلیفہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کیونکہ قاصد ان کے پاس یہ خبر لے کر آیا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے سے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کرنے والی ایرانی فوج پر اسلامی لشکر جب بھی کاری اور فیصلہ کن ضرب لگانا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ادھر ادھر سے کمک پہنچ جاتی ہے جس سے اسکی کھوئی ہوئی قوت بحال ہو جاتی ہے اور وہ از سر نو قتال شروع کر دیتی ہے۔ خلیفہ کو یہ بات بھی بتائی گئی کہ شہر اُبلہ کا شمار ان اہم ترین مراکز میں ہوتا ہے جہاں سے ایرانیوں کے ہزیمت خوردہ لشکر کو مالی اور افرادی قوت فراہم کی جاتی ہے۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابلہ کی فتح اور ایرانی فوج کو ملنے والی مدد کے سلسلے کو منقطع کرنے کے لئے ایک فوج بھیجنا چاہتے تھے لیکن اس وقت ان کے پاس لڑنے کے قابل آدمیوں کی سخت کمی تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت مختلف علاقوں میں جہاد کے لئے جا چکی تھی۔ اس وجہ سے ان کے پاس مدینے میں قابل جنگ مسلمانوں کی بہت ہی قلیل تعداد باقی رہ گئی تھی۔ اس لئے انھوں نے ایسی حکمت عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جس کے لئے وہ معروف تھے۔ یعنی "قائد لشکر کی قوت کے ذریعہ قلت فوج کی تلافی کرنا" چنانچہ انھوں نے اپنے ترکش کے تمام تیروں کو اپنے سامنے بکھیر دیا اور ایک ایک کر کے ہر ایک کو آزمانے لگے۔ آخر کار تھوڑی دیر کے بعد پکار اٹھے۔

"میں اسکو پا گیا۔ ہاں میں نے اسے پالیا"

پھر وہ زیرِ لب یہ کہتے ہوئے اپنے بستر کی طرف چلے گئے۔

"وہ ایسا مردِ مجاہد ہے جسکی شجاعت و بسالت اور جرأت و مردانگی کے گواہ بدر و اُحد اور خندق و یمامہ کے میدانہائے کارزار ہیں۔ نہ اسکی تلوار کا وار کبھی چوکا نہ اسکے تیر کا نشانہ کبھی خطا ہوا۔ پھر یہ کہ اس نے دو ہجرتیں کیں اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والوں میں وہ ساتواں شخص ہے۔"

صبح کو انھوں نے حضرت عتبہ ابن غزوان کو بلا بھیجا۔ جب حضرت عتبہؓ بارگاہ خلافت میں حاضر ہوئے تو امیر المومنین نے ایک مختصر سی فوج کی قیادت ان کے سپرد فرمائی جس کی تعداد تین سو سے کچھ زیادہ تھی اور وعدہ فرمایا کہ وہ بعد میں مزید کچھ آدمی ان کی مدد کے لئے بھیجتے رہیں گے۔

جب اس چھوٹے سے لشکر نے روانگی کا قصد کیا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے اس کے قائد حضرت عتبہ ابن غزوانؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"عتبہ! میں تم کو سرزمین ابلہ کی طرف روانہ کر رہا ہوں۔ ابلہ دشمن کے محفوظ ترین شہروں میں سے ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسکی فتح میں تمہیں اپنی نصرت سے نوازیگا۔ جب تم وہاں پہنچنا تو پہلے اس کے باشندوں کو خدا کی دین کی طرف دعوت دینا۔ ان میں سے جو بھی تمہاری دعوت پر لبیک کہے اسے قبول کر لینا اور جو اسے قبول کرنے سے انکار کرے اس سے ذلت و رسوائی کے ساتھ جزیہ وصول کرنا۔ لیکن اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوں تو ان سے قتال کرنا۔ اور انہیں کسی قسم کی رعایت اور نرمی سے کام نہ لینا۔" حضرت عمرؓ نے نصیحت کے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

"عتبہ! تم اپنی قائدانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اور اس بات سے ہمیشہ ہوشیار رہنا کہ کہیں تمہارا نفس تم کو کبر و غرور میں مبتلا کر کے تمہاری آخرت کو تباہ نہ کر دے۔ تمہیں اس بات کا ہمیشہ احساس رہنا چاہیئے کہ تم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے سرفراز ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ذلت کو عزت اور تمہاری کمزوری کو طاقت میں بدل دیا۔ یہاں تک کہ تم ایک با اختیار امیر اور ایک قابلِ اطاعت قائد بن گئے۔ کہ جب تم کوئی بات کہتے ہو تو وہ بغور سنی جاتی ہے اور کوئی حکم دیتے ہو تو اسکی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ بشرطیکہ تم کو غرور اور فریبِ نفس میں مبتلا کر کے جہنم میں نہ جھونک دے۔ اللہ تعالیٰ مجھکو اور تم کو اس سے محفوظ رکھے۔"

حضرت عتبہؓ اپنی مختصر فوج کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ اور بعض دوسرے مجاہدین کی بیویاں اور بہنیں بھی تھیں جن کی تعداد پانچ تھی۔ ان لوگوں نے ایک ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں نرکل کے بہت زیادہ پودے تھے۔ یہ جگہ شہر ابلہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اس وقت ان لوگوں کے پاس کھانے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی۔ جب یہ لوگ بھوک سے بیتاب ہو گئے تو حضرت عتبہؓ نے چند آدمیوں سے کہا کہ وہ اس سرزمین میں کوئی ایسی چیز تلاش کریں جسکو ہم کھا سکیں۔ تو وہ لوگ اٹھے اور خوراک کی تلاش میں نکل پڑے۔ اس تلاش و جستجو اور حصول غذا کی کہانی ان میں سے ایک مجاہد نے یوں بیان کی ہے۔

"دریں اثناء کہ ہم لوگ کسی قابلِ خوراک چیز کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ ایک جھاڑی میں گھس گئے۔ اس جھاڑی میں ہم کو دو بورے ملے۔ ان میں سے ایک بورے میں کھجوریں تھیں اور دوسرے بورے میں سفید سفید چھوٹے چھوٹے دانے تھے جو زرد رنگ کے چھلکوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ہم ان دونوں بوروں کو کھینچتے ہوئے لشکر کے قریب لائے ہمارے ایک فوجی نے جب اس بورے کو دیکھا جس میں دانے تھے تو بولا کہ یہ کوئی زہریلی چیز ہے جس کو دشمنوں نے ہمارے لئے رکھا ہے۔ اس کے قریب نہ جانا۔ ہم لوگ اس کو چھوڑ کر کھجور پر ٹوٹ پڑے اور اس کو کھانے میں مشغول ہو گئے۔ ابھی ہم کھجوروں کو کھا ہی رہے تھے کہ ایک گھوڑا اپنی رسا تڑا کر اس بورے کے پاس پہنچ گیا اور انہیں سے کھانے لگا۔ ہم نے چاہا کہ مرنے سے پہلے اسکو ذبح کر دیں تاکہ اس کا گوشت ہمارے کھانے کے کام آجائے۔ مگر اس گھوڑے کے مالک نے کہا کہ اسے چھوڑ دو۔ میں رات میں اسکی نگرانی کرتا رہوں گا۔ اگر مجھے اس کے مرنے کا اندیشہ ہوا تو اسے ذبح کر دونگا۔ صبح کو ہم نے دیکھا کہ گھوڑا

بالکل ٹھیک ٹھاک اور تندرست ہے۔ اسکو کوئی نقصان نہیں پہونچا ہے۔

میری بہن نے مجھ سے کہا کہ بھائی جان! میں نے ابا کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اگر زہریلی چیز کو آگ پر رکھ کر پکا دیا جائے تو وہ نقصان نہیں پہنچاتی۔ پھر اس نے تھوڑے سے دانے لئے اور انہیں ایک دیگچی میں رکھ کر اسکے نیچے آگ جلا دی۔ پھر تھوڑی دیر میں وہ پکار اٹھی۔ "ادھر آؤ۔ دیکھو کس طرح اس کا رنگ سُرخ ہوا۔ پھر اس کا چھلکا پھٹا اور اس میں سے سفید دانہ نکل آیا۔" پھر جب کھانے کے لئے ہم نے اس کو ایک طشت میں رکھا تو عتبہؓ نے ہم سے کہا کہ اللہ کا نام لے کر کھاؤ۔ ہم نے اسکو کھایا۔ وہ نہایت لذیذ اور مزیدار تھا پھر بعد میں ہم کو معلوم ہوا کہ اس دانے کا نام دھان ہے۔"

ابلہ جسکو فتح کرنے کے لئے حضرت عتبہ اپنی فوج کے ساتھ آئے تھے۔ ایک نہایت مضبوط اور مستحکم شہر تھا جو دریائے دجلہ کے کنارے آباد تھا۔ اہل فارس نے اسکو اپنے اسلحوں کی ذخیرہ گاہ بنا رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے دشمنوں کی نگرانی کے لئے اسکی فصیلوں پر برجیاں بنا رکھی تھیں، جہاں سے وہ حملہ آوروں پر دور ہی سے نظر رکھ سکتے تھے۔ لیکن مقابلین کی قلتِ تعداد اور سامانِ حرب کی کمی کے باوجود یہ سارے انتظامات حضرت عتبہؓ کو ان کے اوپر حملہ کرنے سے نہ روک سکے۔ اس وقت حضرت عتبہؓ کے پاس لڑنے والوں کی تعداد چھ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ اور ان میں چند عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان کے پاس تلواروں اور نیزوں کے علاوہ دوسرے اسلحے بھی نہیں تھے۔ اس لئے اسکی تلافی کے لئے ان کو اپنی ذہانت اور فوجی سوجھ بوجھ کا استعمال ناگزیر تھا۔

انھوں نے کچھ جھنڈے بنائے اور انہیں نیزوں پر لگا کر عورتوں کے حوالے کیا۔ اور ان کو حکم دیا کہ وہ ان جھنڈوں کو لے کر فوج کے پیچھے پیچھے چلیں۔ اور ان کو اس بات کی ہدایت کی کہ جب ہم لوگ شہر کے قریب پہنچ جائیں تو وہ ہمارے پیچھے خوب گرد و غبار اڑائیں۔ اتنی کہ اس سے پوری فضا ڈھک جائے۔ پھر جب یہ لوگ شہر کے قریب پہنچے تو ایرانی دروازہ کھول کر شہر سے باہر نکلے اور انہیں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا لیکن جب انھوں نے ان جھنڈوں کو ان کے پیچھے حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور فضا کو گرد و غبا

سے اٹا ہوا پایا تو باہم ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ فوج کا ہراول دستہ ہے۔ اسکے پیچھے ایک لشکر جرار ہے جو گرد و غبار اڑاتا چلا آرہا ہے۔ اور ہم لوگ تعداد میں بہت کم ہیں۔ ان کے دلوں میں بزدلی سرایت کر گئی اور ان کے اوپر خوف و ہراس مسلط ہو گیا۔ پھر تو وہ اپنے ہلکے پھلکے اور بیش قیمت سامان سمیٹ کر ان کشتیوں کی طرف تیزی سے لپکے جو دریائے دجلہ کے ساحل پر کھڑی تھیں۔ اور ان پر سوار ہو کر انھوں نے راہِ فرار اختیار کر لی۔

اور حضرت عتبہؓ کسی جنگ و جدال کے بغیر ابلہ پر قابض ہو گئے اور انہیں اپنا ایک آدمی بھی ضائع نہیں کرنا پڑا۔ پھر اسکے ارد گرد کے شہروں اور آبادیوں کو فتح کر لیا۔ اس موقع پر بے شمار و بے اندازہ مالِ غنیمت ان کے ہاتھ آیا۔ ان فوجیوں میں سے ایک شخص جب مدینے واپس آیا اور لوگوں نے اس سے دریافت کیا کہ ابلہ میں مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ تو اس نے کہا کہ تم کس کے متعلق پوچھ رہے ہو؟ خدا کی قسم میں ان کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ لوگ سونے اور چاندی کو وزن کرنے کے بجائے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ یہ سُن کر لوگوں نے اپنی سواریوں کے رُخ ابلہ کی طرف کر دیئے۔

اس وقت حضرت عتبہ ابن غزوانؓ نے محسوس کیا کہ اگر ان کے فوجی ان مفتوحہ علاقوں میں سکونت پذیر ہو گئے تو یہ آرام طلبی اور تن آسانی کے عادی ہو جائیں گے اور یہاں کے باشندوں کے طور اختیار کر کے روحِ جہاد سے یکسر عاری ہو جائیں گے اور ان کے اندر حرب و ضرب اور قتال و جہاد کے جذبات کمزور پڑ جائیں گے۔ اس لئے انھوں نے خط لکھ کر امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ سے شہر بصرہ کی تعمیر کی اجازت طلب کی۔ اور جس جگہ پر وہ اس شہر کو بسانا چاہتے تھے اسکے بارے میں مفصل معلومات خلیفہؓ کو فراہم کیں تو خلیفہ نے ان کو اس کی اجازت مرحمت فرما دی۔

حضرت عتبہؓ نے نئے شہر کی پلاننگ کی اور سب سے پہلے اسکی عظیم الشان مسجد کی تعمیر کی۔ اور اسمیں کوئی حیرت و تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اور ان کے ساتھی راہِ خدا میں جہاد کرنے کے لئے مسجد ہی کے واسطے تو نکلے تھے۔ اور اسی مسجد ہی کی وجہ سے تو ان کو اور ان کے ساتھیوں کو دشمنانِ خدا پر فتح و کامرانی حاصل ہوئی تھی۔

پھر لوگ زمین کے پلاٹوں کے حصول اور مکانات کی تعمیر میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔ لیکن خود حضرت عتبہؓ نے اپنے واسطے کوئی مکان نہیں بنوایا۔ وہ مستقل طور پر کمبلوں سے بنے ہوئے ایک خیمے میں سکونت پذیر رہے۔ کیونکہ وہ اپنے دل میں پہلے ہی سے کوئی بات طے کر چکے تھے۔۔۔۔۔۔۔

حضرت عتبہ نے دیکھا کہ بصرہ میں مسلمانوں کو وہ عیش وآرام اور دنیاوی ساز وسامان حاصل ہوگیا ہے جس کی وجہ سے آدمی از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ اور اپنی اصل حیثیت اور حقیقی ذمہ داریوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ ان کے ساتھی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہی لوگ جو کچھ دنوں پہلے چاول سے زیادہ لذیز تر کسی کھانے سے ناواقف تھے۔ اب نفیس ترین ایرانی کھانے، فالودہ اور لوزینہ وغیرہ مزے لے لے کر کھاتے تھے۔ ایسی حالت میں حضرت عتبہؓ کو دنیاوی عیش وآرام کے مقابلے میں اپنے دین کی حفاظت اور دنیا کے فوری اور عارضی فوائد کے بالمقابل آخرت میں حاصل ہونے والے دائمی اور لازوال منافع کو طلب کرنے کی فکر دامن گیر ہوگئی۔ انھوں نے لوگوں کو بصرہ کی جامع مسجد میں جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر فرمائی۔

"لوگو! یہ دنیا اپنے سفر کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ اور تم اسے چھوڑ کر ایک ایسے گھر کی طرف منتقل ہونے والے ہو جو لازوال اور ابدی ہے۔ تو تم اپنے بہترین اعمال کو ساتھ لے کر وہیں منتقل ہونے کی فکر کرو۔ میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف سات آدمی ایمان لائے تھے۔ اس وقت درختوں کی پتیوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہم کو کھانے کے لئے میسر نہ تھی۔ ان پتیوں کو کھانے کی وجہ سے ہماری باچھیں زخمی ہوگئی تھیں۔ ایک دن مجھے کہیں سے ایک چادر مل گئی۔ اسے میں نے اپنے اور سعد ابن ابی وقاصؓ کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کر دی۔ آدھی چادر میں نے پہنی آدھی سعدؓ نے۔ اور آج ہماری یہ حالت ہے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی شہر کا امیر اور حاکم نہ ہو۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں اپنے آپ کو عظیم سمجھوں لیکن خدا کے یہاں صغیر وحقیر بن جاؤں۔"

اس کے بعد حضرت عتبہؓ نے ان میں سے ایک شخص کو اپنا قائم مقام بنایا اور ان سے رخصت ہوکر مدینہ کا رخ کیا۔ اور بارگاہ خلافت میں پہنچ کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں گورنری سے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ مگر حضرت عمرؓ نے ان کا استعفا نامنظور فرماتے ہوئے انھیں اپنی ذمہ داری سنبھالنے کی تاکید کی۔ حضرت عتبہؓ استعفا کی منظوری کے لئے اصرار کرتے رہے، لیکن خلیفہؓ نے ان کی ایک نہ سنی اور انھیں بصرہ واپس جانے کا حکم دیا۔ آخر کار بادل ناخواستہ وہ اس کے لئے تیار ہوتے اور یہ کہتے ہوئے اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے۔

"خدایا! مجھے اب وہاں واپس نہ لے جا۔ خدایا!۔۔۔۔۔۔۔"

اور ان کی یہ دعا بارگاہ خداوندی میں شرف قبولیت سے ہم کنار ہوئی۔ ابھی وہ مدینے سے زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اچانک ان کی اونٹنی کا پاؤں پھسلا، حضرت عتبہؓ نیچے گر پڑے اور زندگی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(بقیہ اسلامی ادب میں عقیدہ کا تصور)

انسانیت کے اس عظیم مذہب کے رموز ونکات واضح طور پر پیش کئے جائیں جو امن وسکون کی تلاش میں در بدر بھٹکتی دنیا کے مسائل کا حقیقی حل پیش کرتے ہیں۔

عارف اعظمی عمری

نوٹ:۔ یہ مقالہ ادب اسلامی پر کئے جانیوالے اس اعتراض کے پیش نظر لکھا گیا ہے کہ منظوم ادب (شعر) کا تعلق جذبات وجدان سے ہوتا ہے اور اس سے کسی جامد اور ٹھوس حقیقت یا کسی مخصوص عقیدہ وفکر کی ترجمانی نہیں کی جا سکتی جبکہ اسلامی ادب، اپنے ادیب بالخصوص شاعر کو اسلامی اقدار وافکار کا پابند ومقید بناتا ہے۔

ماسٹر اقبال ایم اے بی ایڈ
مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڑھ

حضرت خنساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا

امت مسلمہ کی عظیم خاتون جس نے اللہ کی راہ میں چار جگر گوشوں کو قربان کر دیا پھر بھی یہ حسرت باقی رہی کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔"

میدان قادسیہ ہے۔ ایرانیوں کا ایک عظیم لشکر مٹھی بھر مجاہدین کے خلاف صف آرا ہے۔ مجاہدین کے سالار اعلیٰ حضرت سعد بن وقاصؓ کی قیادت میں شہادت کی آرزو لئے مجاہدین کا دستہ لڑنے کے لئے پر تول رہا ہے کہ چشم فلک ایک اور منظر کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بڑی حیرت سے اس پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتی ہے۔

ایک نحیف و ناتواں مگر روحانی اعتبار سے قوی و توانا عورت جو اپنے چار بیٹوں کو لے کر اللہ کی راہ میں نکلی ہے، اپنے جگر گوشوں سے یوں مخاطب ہوتی ہے۔

"اے میرے جگر گوشو! تم نے اسلام اپنی مرضی سے برضا و رغبت قبول کیا اور اپنی مرضی سے ہجرت کی۔ خدائے حی و قیوم وحدہٗ لاشریک کی قسم تم اپنے باپ کی اتنی ہی اصلی اولاد ہو جتنے کہ میرے بطن سے پیدا ہونے کی وجہ سے میرے ہو۔ میں نے تمہارے باپ کے ساتھ کبھی بیوفائی نہیں کی نہ تو میں نے کبھی تمہارے ماموں کو رسوا کیا۔ تمہارا حسب نسب صاف شفاف اور ناقابل تردید ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے مقابلہ میں لڑنے والوں کے لئے کتنے انعامات کا وعدہ کیا ہے یاد رکھو کہ یہ فانی دنیا ہمیشہ رہنے والی آخرت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ جب جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں تو تم اس میں بے خوف و خطر کود پڑو اور اپنی حربی مہارت کا دل کھول کر مظاہرہ کرو۔ اس یقین و اعتماد کے ساتھ لڑو کہ انشاء اللہ فتح تمہاری ہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر سے کام لو باطل کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ۔ حق کی خدمت کیلئے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔" (آل عمران آیت ۲۰۰)

اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو"

اب چشم فلک تیسرا منظر دیکھ رہی ہے کہ وہ اللہ کے چاروں شیر اپنی والدہ ماجدہ سے مخاطب ہیں۔

"اے پیاری محترم ماں انشاء اللہ ہم آپ کے حکم پر عمل کریں گے اور آپ کی توقعات پر پورے اتریں گے اور ثابت قدم رہیں گے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو"

دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد جب غازیوں کا لشکر ہتھیاروں سے لیس ہو کر کفار کے مقابلہ کے لئے نکلا اور حضرت خنساءؓ کے چاروں بیٹے گھوڑوں پر سوار ہوئے تو عظیم ماں نے انھیں اس دعا کے ساتھ رخصت کیا۔

"اے میرے رب میری یہی ساری متاع ہے جو تیرے حوالے ہے تو اسے قبول فرما۔"

چشم فلک نے حیرت سے دیکھا کہ وہ اللہ کے شیر کس بیباکی اور دلیری کے ساتھ اپنی حربی صلاحیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ لشکر کفار پر اس طرح ٹوٹے پڑ رہے ہیں کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے یہاں تک کہ دشمنوں کے نرغے میں آگئے حتّٰی کہ دلیری کے ساتھ لڑتے ہوئے اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے۔

"صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودان"

جب اللہ کی نیک بندی حضرت خنساءؓ نے اپنے چاروں جگر گوشوں کی شہادت کی خبر سنی تو سجدے میں گر پڑیں اور کہا:

"اے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے میرے جگر گوشوں کو قبول کر کے مجھے سرخرو کر دیا۔ میری تجھ سے التجا ہے کہ حشر کے دن میرے بیٹوں کے ساتھ مجھ پر بھی اپنا فضل فرما"

کاش آج کی مائیں اور نوجوان اس آئینے میں اپنی صورت دیکھتے اور غور کرتے۔ اگر یہ جذبہ شوق جہاد ہزارویں حصے کے برابر بھی مل جاتا تو آج ہمارا یہ حال نہ ہوتا۔

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے جو روح کو گرما دے اور قلب کو تڑپا دے

صابرہ و شاکرہ حضرت خنساءؓ عاشق اسوۂ رسول پاک تھیں۔ ایک عظیم شاعرہ تھیں۔ مرثیہ خوانی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کا اصل نام تماضر تھا۔ وہ اسقدر چست و چالاک تیز و طرار اور خوبصورت تھیں کہ ان کو خنساء کا لقب ملا جس کے لفظی معنی "ہرنی" کے ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق قبیلہ سُلیم سے تھا جو اپنی شجاعت، سخاوت، صداقت اور شرافت کے لئے بہت مشہور تھا۔ ان کے والد کا نام عمرو بن شرید بن رباح تھا۔ وہ خراج امت مسلمہ کیلئے

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

شفق طاہری

غزل

خیال و خواب کے رنگیں غبارے بناتا ہوں
میں پیدل چل نہیں پاتا ہوں سیّارے بناتا ہوں

مرمت کا بہت سا کام پھیلا ہے مرے آگے
کبھی اینٹیں بناتا ہوں کبھی گارے بناتا ہوں

برآمد مجھ کو کرنا ہے حرارت غیر ملکوں میں
جلا کر بستیوں کا تن انگارے بناتا ہوں

کسی امکان سے نکلا ہے کوئی چور دروازہ
اِدھر کچھ دن سے منصوبے بڑے پیارے بناتا ہوں

شفق ہر رات اب یہ شغل ہے گھر کی سیاہی میں
شعاعیں گوندھ کر الفاظ کی تارے بناتا ہوں

شفق طاہری

غزل

زمیں کو خلد کا ہم سر بنانے والا ہوں
میں اس صدی کا مقدر بنانے والا ہوں
میری نواح میں رُک جائیں بادلوں سے کہو
میں سائبان سروں پر بنانے والا ہوں
جو لوگ زخم پہ چھڑکیں نمک بنے مرہم
میں ایسی دھار کا خنجر بنانے والا ہوں
مقابلہ ہے زمانے کے قیصروں سے مرا
میں نوجوانوں کا لشکر بنانے والا ہوں
بلند کیجئے اپنے گھروں کے دروازے
میں آدمی کو قد آور بنانے والا ہوں
جہاں سیاہیاں یلغار کرتی رہتی ہیں
وہاں میں چاند سے پیکر بنانے والا ہوں

★

عزیز بگھروی
عزیز الدین عزیز

حلقۂ یاراں

برادرم فاز قلیط صاحب سلام و رحمت

مارچ ۲۰۰۸ء کا حیات نو نظر نواز ہوا۔ ماشاء اللہ کافی دیدہ زیب ہے، مضامین کا انتخاب بھی بروقت اور مناسب ہے۔ ایڈیٹوریل کی شعلہ بیانی قدرے حد سے تجاوز کر گئی ہے، ہر چند کہ نوجوانانِ ملت کا پرچہ ہے۔ جوش و جذبہ کا اظہار فطری بھی ہے ہم ایک دین وسط کے علمبردار بھی ہیں لہٰذا ہر حال میں ہمیں اعتدال کا راستہ اختیار کرنا ہے اور آپ تو اس سلسلہ میں مجھ سے کہیں زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ ایک اور اہم چیز جو مطالعہ کے دوران مجھے محسوس ہوئی اجازت ہو تو عرض کر دوں۔ آپ کے یہاں پروف ریڈنگ کی طرف سے بہت بے توجہی برتی جاتی ہے۔ اس طرف خصوصی دھیان دینے کی ضرورت ہے رسالوں کے لئے اس کی بہت اہمیت ہوتی ہے اس سے بھی بڑی اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ زبان و بیان اور تذکیر و تانیث کی اغلاط کی جگہ نظر آتیں یا ناقابل برداشت چیز ہے۔ کتابت سے قبل ہر مضمون کو غور سے پڑھنا بہت ضروری ہوتا ہے اس سے پرچے کی ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور جو بدخبری کا سبب بھی بن سکتا ہے، ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک مشورہ یہ بھی دینے کو جی چاہتا ہے کہ پورے پرچے کی کتابت ایک ہی قلم سے کرایئے مثلاً اگر کسی غزل میں اشعار زیادہ محسوس ہوں تو ان کی تعداد کم کر دیجئے پرچے کے حسن پر کمی نہ آنے دیجئے۔ بدلا ہوا قلم ذوقِ نظر پر گراں محسوس ہوتا ہے آپ بھی یقیناً اس سے اتفاق کریں گے۔

والسلام عزیز بگھروی

برادر عزیز طارق فاز قلیط فلاحی صاحب سلام مسنون

"حیات نو" (مارچ) میرے سامنے ہے، پڑھ رہا ہوں، سوچ رہا ہوں۔ اداریہ کے بعد سوچتا ہوں کہ کیا پڑھوں، پہلے انٹرویو یا مقالات، شعر و ادب یا جہاد کے میدان سے۔۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ "نقوشِ حیات نو" نے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے

"بابری مسجد کا سانحہ" کے بارے میں میرا احساس ہے کہ آپ نے اسے سپردِ قلم کیا کاتب کے حوالے کیا، پھر آپ نے اپنا قلم توڑ دیا۔ "حیاتِ نو" طباعت کی منزلوں سے گزر کر آپ تک پہنچا اور آپ نے حسبِ معمول اسکے خریداروں کو (قارئین کو) روانہ کر دیا۔ اور صالح اور بیباک صحافت کا فرض ادا کر دیا۔ بلکہ حق ادا کر دیا۔ برادرِ محترم جس کرب اور درد و سوز کے ساتھ آپ نے یہ اداریہ سپردِ قلم فرمایا ہے اس کے بعد قلم کو توڑ ہی دیا جائے۔ اس لئے کہ ؎

"عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے"

اُف یہ جملہ ہائے درد و غم:

... ہمارے خوابوں کا ہندوستان .... ہمارا ہندوستان کتنا بدل گیا ہے ......
حکمرانوں تم ہم کو کدھر لے جا رہے ہو؟ ...... تاریخ میں ایسی تاریک راتیں بارہا آتی ہیں ...
..... بجلیاں بھی کوندی ہیں ...... طوفان بھی اُٹھے ہیں، لیکن ہم اپنی کشتی کو پار لگانے میں کامیاب رہے ہیں!" یہ حمیتِ ایمانی ہی تو ہے جو جملوں کے پردوں میں چھپی ہے۔

طارق بھائی۔ آپ کی آہ جو دراصل ملتِ اسلامیہ کے دل کی صدا ہے کبھی خالی نہیں جائے گی۔ یقین کیجئے میری غزل جو شاید آخری وقت میں ملی ہوگی اگر اس پس منظر میں پڑھی گئی ہو تو قارئین حیاتِ نو کو خوب لطف آیا ہوگا۔ آپ اسے میرے ترنم میں سنیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ساری ملت اسے گنگنا رہی ہے ؎

نغمۂ توحید دارالکفر میں
گنگنانا اب ضروری ہو گیا

(بقیہ جامعہ کے لیل و نہار)

کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ برادر صبیح اختر عربی سوسائٹی کے سکریٹری اور برادر ابو النصر فارابی اور محمد احمد اس کے ممبر ہوئے۔

عید کے موقع پر یہاں منعقد ہونے والے تقریری اور تحریری انعامی مقابلوں میں برادر محمد محفوظ خاں اور توقیر عالم نے انعامات حاصل کئے اس طرح ایک اور تقریری مقابلہ میں برادر محمد اعظم اور توقیر عالم نے انعام حاصل کئے۔

(بقیہ ص ۱۷ پر)

آل م

جامعہ کے لیل و نہار

"قرآن ایک ایسا سمندر ہے جو بے کنار ہے۔ اس کتاب تک پہنچنے کی سعادت حاصل ہونی یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔" مولانا طاہر مدنی

جامعۃ الفلاح نے ایک اور تعلیمی سال مکمل کر لیا۔ ۲۲ اپریل ۸۶ء کو امتحانات ختم ہو گئے اور تمام طلبہ اپنے اپنے گھروں کو تشریف لے گئے۔ خدا ان کو اپنی حفاظت اور نگرانی میں رکھے انشاء اللہ نیا تعلیمی سال ۸ شوال ۱۴۰۶ھ بمطابق ۱۶ جون ۱۹۸۶ء کو شروع ہوگا۔

۲۳ اپریل ۸۶ء کو انتظامیہ (جامعہ) کا اجلاس منعقد ہوا ....

جس میں اسکول کے مسائل زیرِ غور آئے۔ تعلیمی معیار کو اور اونچا اٹھانے، طلبہ کے لئے رہائشی سہولتیں پیدا کرنے اور بچیوں کے لئے بہتر تعلیمی اور انتظامی سہولتیں فراہم کرنے پر غور کیا گیا۔ اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ نیز ان کے رہائشی ضروریات پر گفتگو ہوئی اور بڑھتی ہوئی مہنگائی پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔

۲۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو چار بجے شام انجمن نے اپنے فارغ ہونے والے اور قافلۂ انجمن کو نئی قوت و توانائی عطا کرنے والے بھائیوں کا دل کی گہرائیوں سے استقبال کیا۔ روح افزا کے ٹھنڈے میٹھے اور فرحت بخش جام کے بعد کچھ گفتگو یوں شروع ہوئی۔ برادر محمد طاہر مدنی نے فرمایا: "قافلۂ انجمن طلبہ قدیم میں شامل ہونے والے تازہ دم دستہ کا میں انجمن کی طرف سے استقبال کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی شمولیت کو باعثِ خیر و برکت بنائے۔

اس مادہ پرستانہ دور میں اللہ نے آپ کو علمِ دین حاصل کرنے اور قرآن و سنت سے واقفیت بہم پہنچانے کا موقع عنایت فرمایا، یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ قرآن ایک ایسا سمندر ہے جو بے کنار ہے اس کتاب تک پہنچنے کی سعادت حاصل ہونی

یہ بہت بڑی بات ہے۔ دین کے تعلق سے آپ پر دو گونہ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔
(۱) قرآن و سنت کا علم سراسر عملی علم ہے۔ زندگی میں اس علم کا جلوہ نظر آنا چاہئے۔ (۲) دین کا علم ایک روشنی ہے اور یہ ان لوگوں کی ذمے داری ہے جو اسے حاصل کرتے ہیں کہ اس روشنی کو پھیلائیں اور تاریکیاں مٹائیں۔

برادر مطیع اللہ صاحب نے بات آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا: ابھی تک آپ اساتذہ کرام کی سرپرستی میں تھے مگر اب خود آپ کو اپنا سرپرست بننا ہے۔ اگر آپ دنیا میں کھو گئے تو یہ ایک بہت بڑی ناکامی ہے اور اگر اپنے تشخص کو باقی رکھا تو ان شاء اللہ ہر جگہ کامیاب ہوں گے۔

نئے آنے والے بھائیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے برادر اسرار احمد نے فرمایا: اگرچہ اساتذہ کرام اور جامعہ کے در و بام سے جدائی کا غم کھائے جا رہا ہے، مگر یہ محفل بڑی پرمسرت ہے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے سیکھا ہے اس پر عمل کریں گے، اور انجمن کی ہر ممکن تعاون کریں گے۔

برادر محمد محسن نیپالی نے فرمایا: اس وقت جبکہ جامعہ کا تمام ماحول ہم کو الوداع کہنے کے لئے تیار ہے، اس کی چہار دیواری میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو ہم سے محبت ہے اور جو ہمارا استقبال کر رہے ہیں۔ انجمن ہمارے اور جامعہ کے لئے ایک نعمت ہے، اس کی وجہ سے جامعہ سے ہمارا تعلق قائم رہتا ہے اور ہم یہاں کے حالات سے باخبر رہتے ہیں۔ انجمن کو ایسے پروگرام ترتیب دینا چاہئے جس سے ہمارے درمیان الفت و محبت پیدا ہو اور فاصلے قربتوں میں بدل جائیں۔

اس سال فارغ ہونے والے تمام (۷۰) بھائیوں کے علاوہ برادر محمد طاہر مدنی، مطیع اللہ فلاحی، نور محمد فلاحی، سکریٹری انجمن، محمد عمران فلاحی، حافظ اسماعیل فلاحی، حافظ احسان الحق فلاحی، محبوب عالم فلاحی، عرفان احمد فلاحی، جمیل احمد فلاحی، طارق فارقلیط فلاحی شریک محفل تھے۔

علی گڑھ فلاح ایسوسی ایشن ۹ تا ۱۳ نومبر برادر مقبول احمد فلاحی کی آمد پر ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں آپ نے ہمارا منصب، نصب العین اور ذمے داریاں یاد دلائیں، ساتھیوں کی طرف سے کئے گئے سوالات کے جوابات بھی دیئے۔ آپ علی گڑھ حیات فلاحی کی توسیع کی غرض سے تشریف لائے تھے۔

یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ برادر زین العابدین، ہال میگزین کے ایڈیٹر اور عربی سوسائٹی

(بقیہ ص ۵۴ پر)